TIGHT BINDING BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY
OU_222654
UNIVERSAL
LIBRARY

٨٩١٥ ع ٣٠٨ U600 P.
عبدالقادر، سرشتهٔ [illegible] [illegible]
P. G.
P. G.
انتخاب مثنوی، حصه اول

OUP—552—7-7-66—10,000

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. Accession No.

Author

Title

This book should be returned on or before the date last marked below.

۷۸۶

انتخابِ مخزن

حصہ اوّل

رسالہ مخزن کی پہلی نو جلدوں کے چیدہ چیدہ نظم و نثر مضامین کا

مجموعہ

بفرمائش

شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ

لاہور

عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام حافظ محمد عالم پرنٹر

مالک شیخ عبدالقادر بی اے ایڈیٹر مخزن

فہرست مضامین انتخاب مخزن حصہ اوّل

الف نثر

نمبر	عنوان مضمون	نام نویسندہ	صفحہ
۱	دنیا کی دلچسپیاں	عبدالقادر	۱
۲	گناہ	آغا شاعر دہلوی	۱۱
۳	طوفان نوح	سیّد شریف حسین	۱۸
۴	رموز حیات		۲۱
۵	احسان اور محبت	لطیف احمد	۳۱
۶	اپنشد	سید علی بلگرامی	۳۸
۷	مطالعۂ الفاظ	احمد دین بی۔ اے	۴۵
۸	دوست	سجاد حیدر	۵۱
۹	زبان اردو		۵۳
۱۰	پرانے لکھنؤ کی ایک جھلک	ہری رام	۶۰
۱۱	شیلے	محمد سعید	۶۵
۱۲	ٹوپی	محمد اکرام	۷۷
۱۳	گاتیاں	عبدالرشید چشتی	۸۲
۱۴	کیا رسم ستی بند ہو گئی؟	عبدالقادر	۸۸
۱۵	نفس کی قوتیں	جیا رام	۹۱
۱۶	سوتاڑہ	عزیز مرزا	۹۴
۱۷	طلسم خیال	ترجمہ	۱۰۰
۱۸	دستار	[illegible]اکرام	
۱۹	چاند اور ستارے	ترجمہ	۱۱۴
۲۰	تصویر کے دو رخ		۱۲۰

نمبر	عنوان مضمون	نام نویسندہ	صفحہ
۲۱	نا کتخدا لڑکی	مہدی حسن لکھنوی	۱۲۷
۲۲	ناکام محبت	نذیر حسین	۱۳۰
۲۳	بدنصیب کا لال	راشد الخیری	۱۳۸
۲۴	بے سروسامانی	عبدالقادر	۱۴۵
۲۵	اعراف کی ایک روح	لطیف احمد	۱۴۹

(ب) نظم

نمبر	عنوان مضمون	نام نویسندہ	صفحہ
۱	کوہستان ہمالہ	اقبال	۱۵۵
۲	جوگی	خوشی محمد	۱۵۸
۳	ندی کا راگ	ظفر علی بی اے	۱۶۲
۴	شکایت زمانہ		۱۶۴
۵	تصویر عبرت	حسرت موہانی	۱۶۶
۶	کمال نقص	فضل حق آزاد	۱۶۸
۷	آغاز محبت	حسرت موہانی	۱۷۰
۸	انجام محبت	نیرنگ	۱۷۱
۹	گمنام نامور	حبیب کنتوری	۱۷۲
۱۰	چمن کی سیر	شاہ دین جج	۱۷۴
۱۱	حالی	صادق علی	۱۷۷
۱۲	رام کہانی	ابو نصر آہ دہلوی	۱۸۱
۱۳	خواب راحت	اعجاز حسین بی اے	۱۸۲
۱۴	جلوہ دربار	اکبر	۱۸۴
۱۵	ہمت و تدبیر	علمدار حسین	۱۸۷
۱۶	قمار	نیرنگ	۱۹۲

نمبر	عنوان مضمون	نام نویسندہ	صفحہ
۱۷	شمع ہستی	مولوی اسمعیل	۱۹۳
۱۸	جوئے آب	نذیر حسین	۱۹۶
۱۹	تسکین قلب	سید علی سجّاد	۱۹۸
۲۰	پدمنی	سرور جہان آبادی	۲۰۰
۲۱	حسن اور زوال	اقبال	۲۰۲
۲۲	مرغ و صیّاد	سرور جہان آبادی	۲۰۳
۲۳	ایک پرندے کی فریاد	اقبال	۲۰۶
۲۴	بادکش کی تقدیر	رام سہائے لکھنوی	۲۰۸
۲۵	بلبل شیدا	احمد حسین خاں	۲۱۰
۲۶	شاہ اور ہم	ونایک پرشاد طالب بنارسی	۲۱۳
۲۷	مبتلائے غم	جلیل	۲۱۷
۲۸	داغ جگر	احسن	۲۱۹
۲۹	مشرقی علم ادب کا پژمردہ باغ	اشہری	۲۲۳
۳۰	ہمارا دیس	اقبال	۲۲۶
۳۱	سپوت بیٹا	عبدالرشید چشتی	۲۲۷
۳۲	رات کے بیچین گھنٹے		۲۳۰
۳۳	نیا شوالہ	اقبال	۲۳۴
۳۴	پھول اور پیام	ترجمہ	۲۳۵

(ج) غزلیات

نمبر	عنوان مضمون	نام نویسندہ	صفحہ
۱	غزل	حسرت موہانی	۲۳۶
۲	"	نیرنگ	"
۳	"	شاد عظیم آبادی	۲۳۷

نمبر	عنوان مضمون	نام نویسندہ	صفحہ
۴	غزل	مرزا ہادی	۲۳۷
۵	〃	ضامن کنتوری	۲۳۸
۶	〃	آغا شاعر دہلوی	〃
۷	〃	اقبال	۲۳۹
۸	〃	حسرت موہانی	۲۴۰
۹	〃	نیرنگ	〃
۱۰	〃	ارشد گورگانی	۲۴۱
۱۱	〃	سجاد عظیم آبادی	〃
۱۲	عید اور انتظار یار	نیرنگ	۲۴۳
۱۳	کبھی کچھ کبھی کچھ	آغا شاعر دہلوی	۲۴۴
۱۴	غزل	حبیب کنتوری	۲۴۵
۱۵	〃	حبیب الرحمٰن شروانی	۲۴۶
۱۶	〃	اقبال	〃
۱۷	〃	شاد عظیم آبادی	۲۴۷
۱۸	〃	حبیب کنتوری	〃
۱۹	〃	صادق علی	۲۴۹
۲۰	〃	ہادی لکھنوی	۲۵۰
۲۱	〃	حیدر بخت	۲۵۱
۲۲	〃	آغا شاعر دہلوی	〃

کتابیں ملنے کا پتہ | ایل ایجوکیشنل بکڈپو جامع مسجد دھلی

دُنیا کی دلچسپیاں

دُنیا بھی اک بہشت ہے اللہ رے کرم
کن نعمتوں کو حکم دیا ہے جواز کا

آدمی بسا اوقات تکالیف کے صدموں سے گھبرا کر یا محنت کی سختیوں سے اُکتا کر کہہ اُٹھتا ہے۔ دنیا میں کیا آئے ایک آفت میں پھنس گئے۔ یا دُنیا ہے۔ کہ ایک سلسلۂ مصیبت ہے کوئی اِسے دوزخ سے تشبیہ دیتا ہے۔ کوئی دارالمحن کے نام سے یاد کرتا ہے۔ گو عملاً سب اس کی محبت میں مبتلا ہیں۔ اور سوائے چند خُدارسیدوں کے یہاں سے کوچ کرنے کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ تاہم ایک زمانہ ہے کہ اِسے بُرا کہنے پر تُلا ہوا ہے۔ ایسی حالت میں اُس حق پسند کی نظرِ غائر کی داد دینی پڑتی ہے۔ جس نے دنیا کی اُلجھنوں سے قطع نظر کر کے اس کی بیشمار دلچسپیوں کا دھیان کیا ہے۔ اور شکر گذاری کا ثبوت دیا ہے۔ اور غفلت کیش انسان کو یاد دلایا ہے۔ کہ اُسے خالق نے کیسی کیسی نعمتیں بخشی ہیں۔ جن سے وہ ہر دم ہر لحظہ فائدہ اُٹھاتا ہے اور اس پر احسان مندی کا یہ حال ہے

ذراسی تکلیف پہنچے اُسے دِنوں نہ مہینوں بلکہ برسوں یاد رکھے اور ہر ایک سے اِس کی شکایت کرتا پھرے اور جو لطف ہر گھڑی نصیب ہوا ہے اُسے بھول جائے۔ اور اس کا شکر زبان پر لانا تو درکنار دل میں بھی کم آنے دے۔ جو قیود مذاہب نے بعض چیزوں کے متعلق لگا دی ہیں۔ اُن سے تو گھبرائے لیکن اُن کے مقابل جو جو چیزیں جائز کر دی ہیں اور جن کی اجازت ہے کہ کھُلے بندوں اور دل کھول کر اُن سے حظ اُٹھاؤ۔ اُن کا ذکر نہ کرے بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ کا مفہوم اگر ذہن میں رہے تو ایسی غفلت ممکن نہیں۔ مگر نسیان تو اس کی گھٹی میں پڑا ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو احسانات الٰہی کو نہیں بھولتے۔ اور اُن کے سامنے دنیا کی معمولی کلفتوں اور رنج کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے۔

ذرا آنکھ کھول کر دیکھو۔ کیا بہار ہے! نسیم کے ہلکے جھونکے۔ بادِ صبا کی اٹھکیلیاں۔ چلتے ہوئے پانی۔ بہتی ہوئی ندیاں۔ شفاف جھیلیں۔ ذخّار سمندر آسمان سے باتیں کرتے ہوئے پہاڑ اور اُن کی برف سے ڈھپنی ہوئی چوٹیاں پھولوں کے تختے اور پھلوں سے لدی ہوئی ڈالیاں۔ درخت اور اُن کے ہرے ہرے پتے۔ سبزہ اور اُس کا فرشِ زمرّدین۔ پکتے ہوئے کھیت اور اُن میں قوتِ زندگی سے بھرے ہوئے سُنہری خوشے۔ نگاہ کے لئے جنت نہیں تو کیا ہے؟ بلبل اور اُس کی خوش نوائی۔ فاختہ اور اُس کی کوکو۔ کوئل اور اُس کی کوک۔ پپیہا اور اُس کی "پی" یہ نغمہ نہیں تو کیا ہے؟ اسی کو تو فردوسِ گوش کہتے ہیں۔ قدرت کا یہ ساز ہر وقت تمہارے خوش کرنے کو تیار رہتا ہے اس کا سازندہ نہ کبھی تھکتا ہے نہ اس کی آواز میں ضعف آتا ہے یہ وہ ساز ہے جس کے لئے بگڑنا نہیں بنا۔ اور قدرت کا حُسن کچھ مناظر کوہ و دشت اور باغ و راغ ہی پر ختم نہیں ہو گیا۔ نہ اُس کی آواز پرندوں کی خوش الحانی تک محدود ہے۔

لہ قرآن مجید میں ہے "اپنے خدا کی نعمتوں کا ذکر کر" ۱۲

آنکھ بینا ہو تو ہر جگہ حُسن کا جلوہ ہے۔ غزال کی آنکھ اور مور کے پر اور شیر کی کھال تو خوب صورت مشہور ہی ہیں۔ مگر جن جانوروں کو حُسن سے بظاہر کچھ خاص مناسبت نہیں۔ ان کو اگر باریک بین نگاہوں سے دیکھو تو ایک ایک جامع اوصاف ہے شکل پر کیا موقوف ہے۔ جوہر اچھے ہوں تو کیا دل نہیں لے لیتے؟ شتر سوار سے پوچھو جس کی سانڈنی لق و دق اور بے آب و گیاہ میدان کے کالے کوسوں کی منزل طے کر کے آئی ہے۔ کہ اُترتے ہی اُس کے گلے سے لپٹا جاتا ہے۔ اپنی آسایش کی فکر پیچھے کرے گا۔ پہلے اپنی وفادار سواری کے لئے آب و دانے کا بند و بست کرے۔ تیز گام تازی اپنے یکہ تاز سے وہ پیار لیتا ہے کہ کسی معشوق کو کم نصیب ہو جس حرمان نصیب بڑھیا کے لڑکے لڑکیاں اُسے چھوڑ کر چل دیئے ہوں اور جسے تنہائی کی مونس ایک بلّی نصیب ہوئی ہو۔ اُس سے اُس بلّی کے حُسن دلفریب کی تعریف سُنو۔ اور جن ملکوں میں کُتّوں کو پالنے کی رسم عام ہے اور مذہباً کوئی نفرت ان سے موجود نہیں۔ وہاں ذرا کُتّوں کی قدردانی ملاحظہ کرو۔ اچھی اچھی حُسن کی پتلیاں اُن پر قربان ہوئی جاتی ہیں اور کہتی ہیں "او حُسن کی کان" "او ملاحت کی جان"! اس بڑھیا کے کان بلّی کی "میاؤں" ہی میں موسیقی کے سارے سُر تال موجود پاتے ہیں۔ اور کُتّے کی وفا کی فدائی جوان عورت کے نزدیک اُس کی آواز چنگ و دف کی صدا ہے۔ اور دنیا بھر کی مختلف اصوات کے ملنے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے۔ جس کا نام عوام کی اصطلاح میں "شور" ہے اُسے درد آشنا اہل دل مختلف سروں کا ارگن سمجھتے ہیں۔ اُن کے خیال میں کوئی سُر غلط نہیں اور کوئی صورت قبیح نہیں۔

گرمی کے دن اور اُن میں ٹھنڈا پانی سردی کے دن اور اُن میں سورج اور دھوپ برسات کا موسم اور اس میں ابر اور گھٹائیں۔ بہار کی فصل اور اُس کا جوبن۔ سب نعمتیں ہیں۔ جن میں انسان کا حصّہ ہے۔ قدرت نے اُس کی

حفاظت کا ہر موسم اور ہر آب وہوا کے مطابق کچھ نہ کچھ بندوبست کیا ہے۔
اور اس پر قادر مطلق کا یہ احسان مزید ہے کہ اس کو ایک چیز ایسی دے دی ہے
جس کے زور پر یہ نہ صرف اپنی حفاظت کا بلکہ اپنے آرام اور آسایش کا
پورا پورا سامان کرسکتا ہے۔ اور وہ چیز عقل ہے۔ عقل انسانی نے صفحہ قدرت
کے متن پر خوب خوب حاشئے چڑھائے ہیں۔ اور ان میں عجب عجب گلکاریاں
کی ہیں خسخانہ و برفاب راحت گرما ہیں تو قہوہ خانہ و گرمابہ فرحت سرما۔ باریک
ریشمی ململ اور جالیاں گرمی کے لئے اور سمور اور پشمینہ سردی کے لئے پہننے
کا سامان ہیں۔ جاڑوں کی راتوں کے لئے لحاف اور گرمیوں کی تپش کے لئے
پنکھے۔ یہ سب دولتمندوں کے لئے ہے۔ مگر غریب بھی خدا کے فضل سے
محروم نہیں۔ لاکھ دولتوں کی ایک دولت قناعت ہے جس کو نصیب ہو۔
اور غریبوں میں امیروں کی نسبت اس کا وجود زیادہ ثابت ہے۔ امیر کو جوں جوں
آرام کے اسباب ملتے جاتے ہیں ۔کہے جاتا ہے "اور" غریب کو جو مل گیا۔ اُسی
کو صبر شکر سے لے کر بال بچوں میں خوش ہو بیٹھتا ہے۔ گرمی میں دوپہر
کے وقت درختوں کا سایہ اُسے خسخانے سے بہتر ہے اور سردی میں
سورج اُس کے کمرے کی انگیٹھی ہے۔ رات کو اگر تکلف لحاف بستر نہیں
تو کیا ہوا گدڑی یا کملی میں لپٹا ہوا ہے۔ یا چند سوکھی لکڑیوں کا ایک ڈھیر جمع
کر لیتا ہے اور اُن کو جلا کر اُس کے قریب رات کاٹ دیتا ہے۔ گھر ہو اور
اس میں اتفاق تو ایسی غریبی بھی کٹ جاتی ہے۔ اور پھر دولت تو ڈھلتی ہوئی
چھاؤں ہے کیا جو غریب ہیں وہ ہمیشہ غریب ہی رہیں گے۔ کیا اُن کی یا اُن
کی اولاد کی کبھی نہیں سُنی جائے گی؟ امید اُن کے کان میں یہ خوش آیند
آواز ڈالتی ہے ؎

رسید مژدہ کہ ایام غم نخواہد ماند　　چناں نماند و چنیں نیز ہم نخواہد ماند

انسان نہ دیکھے اور بات ہے ورنہ خود اُس سے کئی درجہ افضل چیزیں

حکمت ایزدی سے اس کی خدمت میں مصروف ہیں۔ آفتاب اس کے لئے سمندروں کے پانی کو اُبالتا ہے اُن کے بخارات کو اُڑا کر بادل بناتا ہے۔ بادل برستے ہیں تو زمین سرسبز ہوتی ہے۔ پھر آفتاب چمکتا ہے تو کھیت پکتے ہیں اور میوے کھانے کے لائق بنتے ہیں۔ ہَوا جو انسان کی زندگی کا سہارا اور بہت سی چیزوں کی ہستی کا راز ہے۔ انسان کے لئے چکی تک پیستی ہے۔ پانی چلتا چلتا انسان کے سو کام کر جاتا ہے۔ کھیتوں میں سے ہو نکلا تو وہ ہرے ہو گئے۔ باغ میں جا پہنچا تو اس میں پھل پھول آ گئے کشتی کو اُس کی چھاتی پر رکھ کر کہہ دو بھئی ذرا اسے بھی ساتھ لئے جانا۔ تو اُسے عذر نہیں اُس میں دس بیس سو پچاس یا زیادہ آدمی چڑھ بیٹھیں تو اُسے کچھ پرواہ نہیں۔ اور تو اور بوجھ جتنا اور جس قسم کا چاہو لادو انکار نہیں۔ بہائے لئے جاتا ہے۔ آگ آدمی کے لئے کھانا پکاتی ہے۔ روشنی مہیا کرتی ہے اور اس کے سوا کسی اور کام میں جوت دو تو اپنی قوت خدمت کے لئے حاضر کر دیتی ہے۔ ریلوے کے انجن۔ دُخانی جہاز۔ اور کارخانوں کی کلیں آگ ہی کے زور سے چل رہی ہیں۔ اِن قوتوں سے بالاتر ایک قوت ہے جسے برق کہتے ہیں۔ یہ پہلے صرف چمک کر ایک آنِ واحد میں غائب ہو جاتی تھی۔ اور انسان کی شایق نظر کو ایک جھلک دکھا کر اُس سے اپنا چہرہ چھپا لیتی تھی۔ اسے دیکھ کر انسان پہلے دہل جاتا تھا یا غش کھا کر گر پڑتا تھا۔ اب یہ بھی عقل انسانی کی ترقی کے آگے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہے انسان کبھی اسے پیام بری کی خدمت سپرد کرتا ہے اور کبھی اسے گھوڑے کی جگہ گاڑی میں جوتتا ہے۔ اور اس پر غضب ہے کہ جس نے یہ عظمت اور عزت دی اُس کا شکر ادا نہیں کرتا۔

تمتع کے موقعے اس کثرت سے ہیں۔ کہ اُن کی کثرت طبیعت کو اُن سے غافل کر دیتی ہے۔ کھانے کی چیزوں ہی کو دیکھو۔ سرد ملکوں کے

خوش ذائقہ انگور اور سیب اور گرم ملکوں کے مرغوب میوے آم اور خربوزے قوت ذائقہ کے لئے اس سے بڑھ کر لذت کیا چاہتے ہو۔ لوگ انہیں بہشتی میوے کہتے ہیں اور مراد یہ لیتے ہیں کہ یہ بہشت سے آئے ہیں۔ کتنا بھونڈا تخیل ہے یہی کیوں نہیں کہتے۔ کہ یہ بہشت ہے جس میں ایسے ایسے میوے میسر ہیں۔ اور انہیں پر کیا منحصر ہے۔ اپنی اپنی جگہ ایک سے ایک بڑھ کر ہے۔ رنگترہ اور نارنگی کھاؤ تو قلب کو تفریح ہو اس سے بڑھ کر اُن کی خوبی کیا ہوگی۔ کہ مادی چیزیں ہیں مگر تفریح قلب کا مادہ اُن میں موجود ہے۔ آلوچہ اور خوبانی کا قدرت نے اپنے ہاتھ سے جوڑا ملایا ہے۔ ہرے بادام اور سبز پستے۔ ان سب کو روز چکھتے ہو اور پھر کہتے ہو[۱] ہم پر من وسلوے نہیں اُترتا[۱] اس سے بڑا خوانِ کرم کون بچھا سکتا ہے اور کس نے کبھی بچھایا۔ مائدہ من السما کی تفسیر ہے۔ کوئی اپنا پکایا ایک کھانا تو ان "بہشتی" کھانوں کے مقابلے میں پیش کرو۔ اور تمہارے پکائے ہوئے کھانے کیا ہیں انہی کھانوں کی نامکمل نقل ہے حلوائے بادام بناتے ہو۔ کہ بادام کے ذائقے سے کسی قدر مشابہ ہو۔ اگر یہ قدرت کے عطا کئے ہوئے مصالح نہ ہوں تو تمہارا کوئی کھانا مکمل اور مزے دار نہ ہو۔ طرح طرح کی[۲] رقعہ دوزی کر کے اُسے ان چیزوں سے سجا لیتے ہو تو تمہارا دسترخوان پُر رونق ہو جاتا ہے۔ اور یہ من وسلوے بغیر اقرار احسان کے کھاتے کھاتے جب تھک جاتے ہو۔ تو بقلھا وقثائھا پکارنے لگتے ہو۔ اُس وقت گاجر۔ مولی۔ لہسن۔ پیاز ماش اور مسور کی دال کھیرا ککڑی وہ مزا دیتے ہیں۔ کہ سیب و انگور اور سردے اور آم کو بھلا دیں سمجھتے ہو کہ کتاب مقدس میں پرانوں کی کہانی بیان ہوئی

---

[۱] حضرت موسیٰ کی اُمت نے اُن سے کہا تھا کہ ہمارے لئے پکا پکایا کھانا اور چنا چنایا دسترخوان آسمان سے اُترے تو مانیں آخر من وسلوی اُترنے لگا۔

[۲] لیکن جب کھاتے کھاتے تھک گئے۔ تو سبزی ککڑی چنے اور مسور کی دال مانگنے لگے۔

ہے مگر یہ معلوم نہیں کہ تمہارے دلوں کا بنانے والا اور جاننے والا اُس کہانی کے بیان کرنے میں فطرتِ انسانی کا راز بتا رہا ہے۔ تاریخ روز اپنے آپ کو دُہرا رہی ہے۔ اور تمہیں خبر نہیں ہوتی۔

ذائقے سے کہیں نفیس وہ حس ہے۔ جسے شامّہ کہتے ہیں۔ اس میں نہ کچھ کھانا ہے نہ پینا۔ نہ چھونے کی ضرورت ہے۔ صرف کسی خوشبو کے قریب آنے کی دیر ہوتی ہے کہ مشامِ جان تازہ ہو جاتا ہے۔ دل میں مسرت محسوس ہوتی ہے۔ اور باچھیں کھل جاتی ہیں خدا جانے اس میں کیا تاثیر ہے۔ اور اس نے یہ اُڑ کر پہنچنے کی طاقت کہاں سے پائی ہے۔ کہ آنکھ کو کوئی سبب نظر نہیں آتا۔ اور طبیعت ہے کہ خوش ہوئی جاتی ہے۔ آدمی ایک ٹھنڈا سانس کھینچتا ہے۔ کہ شاید سانس سے شامل ہو کر یہ نعمت اندر چلی جائے اور اپنی ہو رہے مگر نہیں۔ وہ ایک گذران لطف ہوتا ہے۔ جو پل بھر میں چل دیتا ہے۔ اور وہی سانس جو اندر سے واپس آتا ہے تو گرم اور افسردہ ہوتا ہے اور اس میں خوشبو کا کوئی پتہ نہیں ہوتا۔ کبھی ایسے جنگل میں گذر ہو جہاں گلاب کا تختہ کھلا ہوا ہو۔ یا جہاں اور پہاڑی پھولوں کی مہک دور سے آرہی ہو اور تمہیں اپنی طرف بُلا رہی ہو۔ تو ضرور جی چاہے گا کہ وہیں جھونپڑا بنا لو۔ اور بیٹھ رہو۔ اگر یہ نہیں نصیب ہوا۔ تو فصلِ گل میں کسی باغ میں جا نکلو۔ خوشبوئیں تو اچھی اچھی ہیں۔ مگر مونیا کھلی ہو تو معلوم ہو کہ تیزی کے ساتھ مستی کس حکمت سے ملائی گئی ہے۔ اور پھر کیوڑے کی جنوں انگیز خوشبو۔ کرنے کی جانفزا مہک اور بیدِ مشک کی سوکھی لکڑی میں دھانی رنگ کے پھول اور ان کی بھینی بھینی بو۔ کوئی کس کس حسن پر جان دے۔

اُستادِ قدرت کی اُستادی قابلِ دید ہے۔ ذہنِ انسانی کی ترقی کے لئے کیسا زینہ بنایا ہے۔ مادی اشیاء سے اس مکتب میں ابجد شروع ہوتی ہے۔ اُن کا ذائقہ حسن کو گرویدہ کرتا ہے۔ اس کے بعد درجۂ دوم کی مادی اشیاء

آتی ہیں مثلاً سردی۔ گرمی جن کے متعلق کھانا استعارے کے طور پر بولتے ہیں۔ لیکن جو فی الحقیقت کھانے اور چکھنے میں نہیں آتیں دھوپ نظر بھی آتی ہے۔ محسوس بھی ہوتی ہے۔ بدن پر اثر بھی چھوڑتی ہے۔ مگر پھر بھی ایسی چیز نہیں جیسے لونگ اور دارچینی کہ کھانے سے بدن میں حرارت معلوم ہو۔ اسی طرح سردی بدن کو لگتی ہے۔ دماغ پر اثر ڈالتی ہے۔ کبھی کبھی دل تک بھی پہنچتی ہے۔ برف و باراں کی وجہ سے ہو تو ایک حد تک نظر بھی آتی ہے پر اس قسم کی نہیں جیسے طباشیر اور سرد چینی۔ کہ کھائیں اور زبان سے لے کر دل تک ٹھنڈک پہنچ جائے۔ دوم درجے کی مادی اشیاء کے بعد خوشبو سبق دینے آتی ہے کہ اس کا سبب تو نظر کے سامنے ہے۔ مگر وہ خود نظر نہیں آتی ہاں اس کا اثر موجود ہے۔ اس کے بعد ایک چیز آتی ہے۔ جو خوشبو سے بھی بدرجہا زیادہ لطیف ہے اور وہ حسن ہے۔ دیکھتے ہی دل قابو سے نکلا جاتا ہے اس میں ایک بیقراری اور تڑپ محسوس ہوتی ہے۔ ایک قسم کی لذت اس لطف میں شامل ہے۔ جو اپنے ساتھ درد کی کیفیت بھی رکھتی ہے۔ اس پر اتنی مرغوب ہے کہ کوئی اس درد سے خالی نہیں رہنا چاہتا۔ یہ لذت اور سب لذتوں سے نرالی ہے۔ نہ اس کو کسی لذت سے تشبیہ دے سکتے ہیں نہ اس کو کسی طرح بیان کر سکتے ہیں۔ اہل ذوق اس سے واقف ہیں۔ اور وہی اس کو سمجھ سکتے ہیں۔ بس اس کے آگے "حسن مطلق" کی شناخت تک ایک ہی زینہ رہ جاتا ہے۔ مگر انسانی بصیرت کی معمولی حد یہیں تک ہے۔ یہاں پہنچ کر بہت سی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ اور آخری زینے پر نظر ڈالنے کی تاب نہیں لا سکتیں کم لوگ ہیں جو آخری زینے پر کھڑے ہو کر موجودات عالم پر نظر ڈالتے ہیں یا اُن سے پرے تک دیکھتے ہیں۔ لیکن اگر آدمی غور کرے تو قدرت نے سبق پڑھانے میں اور سدھوں کی ترتیب مکمل اور آسان کر دینے میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا۔ اُس بینائی پر حیف ہے جو اتنی قریب مثال کے ہوتے

یہ کیسے۔ کہ مجھے نظر نہیں آتا۔ تو میں کیوں کر مانوں۔ میں دیکھ نہیں سکتا تو میں کیونکر متاثر ہوں۔ میں دور رہوں۔ میں کیا کروں۔

بریں دو دیدۂ حیرانِ من ہزار افسوس
کہ با دو آئینہ رویش عیاں نمے بینم

لیکن ہم تو دنیا سے آگے نکل چلے۔ ابھی تو اسی کی دلچسپیاں ختم نہیں ہوئیں خیر اُن کا ختم ہونا تو مشکل ہے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ اُن میں سے جس ایک سلسلے کا بیان ہم نے شروع کیا تھا۔ اُس زنجیر کے ایک دو حلقے ابھی باقی ہیں۔ ہم نے "حسن" کا نام لیا تھا۔ اُن چند لوگوں کو چھوڑ کر جو "حسن" کی جھلک کوہ و دریا اور دیگر مناظر قدرت میں دیکھتے ہیں اور اس سے پھاند کر منزل کو جا لیتے ہیں۔ حسنِ انسانی، میں دیکھ کر دور ہی سے تڑپتے ہیں اور تڑپتے تڑپتے منزل پر جا رہے ہیں۔ اُن بیشمار مثالوں کی طرف آئیے۔ جو "حسن" کو دیکھ کر اُس کو اپنا بنانے کی آرزو کرتے ہیں۔ اور آسانی کے لئے اس صیغے میں حسنِ انسانی کے فدائیوں کو دیکھو۔ ان میں کئی ایسے خوش قسمت ہیں۔ جو اس آرزو میں کامیاب ہوتے ہیں۔ جس حسین پہ آغازِ عشق میں اُن کی نظر پڑتی ہے۔ آخر اُس سے ملنا ہو جاتا ہے۔ دنیاوی رسوم اور مذہبی قوانین دونوں اس اتحاد کو تسلیم کر کے اپنی منظوری کا سہرا طالب و مطلوب کو پہناتے ہیں۔ اور دعا دے کر رخصت کرتے ہیں کہ جاؤ۔ خوش رہو آباد رہو۔ پھلو پھولو۔ آگے چل کر درختِ امید ثمر لاتا ہے۔ حُسن پھر نئی کونپلیں نکالتا ہے۔ ماں باپ لڑکے لڑکی کی پیشانی میں پھر اُسی نور کی جھلک دیکھتے ہیں۔ جس نے انہیں جوانی میں ایک دوسرے کا دالہ و شیدا کیا تھا۔ اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ اُس کی ہر ایک بات میں اپنی کسی عادت۔ کسی خصلت۔ کسی کمال ظاہری یا باطنی کا نقش دیکھتے ہیں اور باغ باغ ہوتے ہیں۔ یہ وہ خوشی ہے۔ جس کے ساتھ کی دنیا میں کوئی اور مسرت نہیں ہو سکتی۔ بس پوچھو کہ آیا جو نعمتیں جائز کی گئی ہیں۔ اُن کا پلڑا ممنوعات اور مکروہات

دنیا سے بھاری ہے یا نہیں۔ یہ خوش قسمت جوڑا تو جو جواب اس سوال کا دے گا وہ تو ہم سمجھ ہی سکتے ہیں۔ لیکن ممکن ہے کہ کوئی اور یاس و حرمان کا ستایا ہُوا دل پکار اُٹھے۔ دنیا کی خوبیاں تو گن ڈالیں۔ مگر تصویر کے دوسرے رُخ کو بھی دیکھو۔ غور کرو۔ دنیا میں کتنی مصیبت ہے کتنی بیماریاں ہیں کتنا افلاس ہے کتنی لڑائیاں کیسی خونریزیاں ہیں بجلی کتنے خرمن جلاتی ہے۔ آگ کتنے گھر پھونکتی ہے۔ موت کیسے کیسے خاندان تباہ کرتی ہے۔ غرض ہزار آفتیں ہیں اور ایک انسان کی جان ع

ہرچہ آید بر سرِ فرزندِ آدم بگذرد

یہ بیچارہ سب ستم سہے جاتا ہے اور اُف نہیں کرتا ہے" مگر یہ شکایت کرنے والے خواہ کتنے ہی حق بجانب ہوں۔ انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ دُنیا اضداد سے پیدا کی گئی ہے ہر ایک چیز کا وجود اس کے ضد کے وجود کا متقاضی ہے۔ دھوپ کے ساتھ سایہ لگا ہُوا ہے۔ اور دھوپ کا احساس ناممکن ہوتا اگر ساتھ سایہ نہ ہوتا۔ ایک مثبت ہے۔ دوسرا منفی۔ دونو لازم و ملزوم ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ حکمتِ بالغہ کا مقصدِ اصلی کیا ہے۔ اور اس میں انسان کا کیا حصہ ہے نگاہ میں وسعت اور عمق پیدا ہو جائے تو تمام تکالیف خیر محض دکھائی دیں اور ہر منفی کی تہ میں کچھ مثبت پنہاں نظر آنے لگے۔ یہی وہ سرمہ ہے جس کے لگاتے ہی آنکھ گرد و پیش جنت ہی جنت دیکھتی ہے۔ اور دلِ مرحوم داغ شیریں بیان کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر گاتا ہے۔ کہ دنیا بھی اک بہشت ہے۔

عبدالقادر

گناہ

ایک مغربی مہذب کا مقولہ ہے جس کے معنے ہماری زبان میں یہ ہو سکتے ہیں کہ گناہ برائی کا بادل ہے جو بربادیوں سے لبریز ہے۔ الحفیظ! الامان! اگر ان لفظوں میں کچھ سچائی ہے۔ اگر اس فقرے میں کوئی حقیقی خوفناک اثر ہے اگر دیکھنے سننے والے کی نگاہیں اور کان واقعی طور سے غور و فکر سے ادھر متوجہ ہیں تو اس میں ذرا شک نہیں کہ ضرور رونگٹے کھڑے ہو جاویں گے دل لرز جائے گا۔ کلیجہ کانپنے لگے گا۔ اور ندامت کا پسینہ ماتھے پر ہوگا۔ اے گنہگار دل! میں تجھ سے پوچھتا ہوں کیا تو ماں کے پیٹ سے ایسا ہی پیدا ہوا تھا۔ نہیں نہیں اس عالم کا مجھے یوں ہی سا خیال کبھی کبھی آ جاتا ہے تو اک نورانی آئینہ تھا تو اک لہلہاتا ہوا کنول تھا۔ تجھ میں سیاہی کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ تو پنکھڑی سے زیادہ ہلکا۔ حباب سے زیادہ نازک تھا اور تجھ میں سے بہشت کے پھولوں کی خوشبو آتی تھی۔ ہائے جب میں پنگوڑے میں لیٹا ہوا انگوٹھا چوسا کرتا تھا۔ وہ گھر کی انگنائی گرمیوں کی راتیں اور وہ کسی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی (چاندنی) کا آپ ہی آپ میری ایک ہی جگہ تک جانے والی نگاہوں میں گھل مل جانا۔ میرے سر پر جو ایک نیلی سی چھت (آسمان) ہوتی تھی اسمیں سفید سفید ہزاروں لاکھوں بلکہ ان گنت چمکتی ہوئی چیزیں (تارے) پھر کرتی تھیں۔ وہی ٹھنڈی ٹھنڈی سنہری چیز جو ایک گول گول زرد زرد گل سے نکلے (چاند) میں سے آتی تھی اس سے میں پہروں کھیلا کرتا تھا۔ میں بہتیرا ہُمک ہُمک کر اپنے ننھے ہاتھ بڑھاتا کہ کسی نہ کسی طرح اسے بھی کھینچ کر اپنے چھوٹے چھوٹے تکیوں میں ملا لوں لیکن نہیں وہ مجھ سے بہت دور رہتا تھا اور میرے ہاتھ نہ آتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی نرم نرم چیز (ہوا) ایکا ایکی میرے پاس آ جاتی

تھی۔ میرے جھنڈ دلے بالوں کو پریشان کر دیتی تھی میرا ننھا سا کرتہ اُڑنے لگتا تھا اور بے اختیار میری آنکھیں بند ہو جاتی تھیں۔ بہت سی آوازیں میرے کانوں میں آیا کرتی تھیں مگر میں اپنی دُھن میں ایسا ہوتا تھا۔ کہ کسی کی ایک نہ سُنتا تھا۔ میری پاک دُنیا وہی تھی میری سچّی خوشی کا وہی زمانہ تھا میری بادشاہت کی وہی گھڑیاں تھیں اور اس زمانے میں او آستین کے سانپ (دل) تو مجھے کیا بھلا معلوم ہوتا تھا؟ اس کے بعد میرا دودھ بڑھا میں گھٹنوں چلنے لگا اور مجھے ضدیں کرنی آگئیں۔ آہ اے کافر (دل) بس یہ ابتدا تھی میرے گناہ کی۔ پہلا گناہ جس کی مجھے عادت پڑنی شروع ہوئی وہ میری پیاری ماں کی نافرمانی تھی۔ وہ مادر مہربان جو ہمیشہ آپ گیلے میں سوتی اور مجھے سوکھے میں سُلاتی تھی۔ کڑوی کسیلی ثقیل چیزیں کھانے پینے کو منع کرتی تھی اور میں ضدیں کرتا تھا۔ مچلتا تھا روتا تھا کہ نہیں میں تو یہی کھاؤں گا۔ وہ عفیفہ مکرمہ مجھ کو بیماری کے خوف ہوا زدگی کے خیال سے پانی سے نہیں کھیلنے دیتی تھی۔ گود سے نیچے نہیں اُتارتی تھی اور میں بے شرم بے حیا نافرمان اُس کی ایک نہ سُنتا تھا۔ اُس کے حقوق سب بھلا دیئے تھے زبردستی اُترتا تھا کیچڑ میں کھیلتا تھا۔ کپڑے سان لیتا تھا اور جو چیز پاتا تھا مُنہ میں ڈال لیتا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ ممنوع باتیں میری عادت بن گئیں اور شفیق ماں باپ نے لاڈلے بچے کی ہر تقصیر سے چشم پوشی کی۔ افسوس صد افسوس یہ چشم پوشی کرنی عین نقصان تھی۔ وہی عادتیں بڑھتے بڑھتے گناہوں کی شکل پیدا کرنے لگیں۔ ایک میں سے دو اور دو میں سے چار شاخسانے پیدا ہوگئے اور اس شفاف دل پہ جو فطرت نے اپنے نور سے مجلّا کر کے مجھے دیا تھا بدنما سیاہی کی جھلکیاں بھی نمودار ہونے لگیں۔ گو اس وقت اس تغیّر کے سمجھنے کی قدرت نہیں رکھتا تھا مگر رفتہ رفتہ محسوس کرنے لگا۔ کسی قدر بڑا ہوا تو مجھے ادب آداب کی تربیت ہونے لگی۔ لکھنا پڑھنا شروع ہوا۔

منت مرادوں کی بھرمار تو پہلے ہی سے تھی اللہ امی (آمین)) پیر غلامی تو ایک مدت سے ہو رہی تھی اب اُستاد رکھے جانے لگے نئے نئے چاؤ نئے نئے ارمان دو سے چار آنکھیں ہو گئیں۔ اور ان مدارج نے مجھے اور بھی شہ دینی شروع کی۔ مجھ پر اس پیار اخلاص اور دھوم دھام نے الٹا اثر کیا۔ اب میں ضرورتاً اپنی جان چھڑانے کے لئے چغلیاں کھانے لگا۔ جھوٹ بولنا آگیا ایک کی دو اور دو کی چار، ادھر کی اُدھر لگانی سیکھیں اور آئے دن نئے سبق کے بدلے مختلف چھوٹے چھوٹے گناہوں کے سبق حفظ یاد کر لئے۔ بُرے کھیلوں کی طرف رغبت۔ اچھی باتوں سے نفرت۔ محلے کے رذیل بچوں سے گالی گلوچ۔ اپنی بہیّت کے لئے جھوٹی جھوٹی قسمیں۔ حیلے بہانے پہروں گھر سے غیر حاضر رہنا سیکھا۔ بزرگوں نے گو اس پر اکثر توجہ کی سزائیں بھی دیں۔ نیک صحبت نیک راہ چلانا چاہا مگر ابتدا بگڑ چکی تھی ؎

خوئے بد در طبیعتے کہ نشست
نرود جز بوقتِ مرگ از دست

گناہ کی لت جو خمیر میں سرایت کر گئی تھی اب کب چھٹتی تھی۔ پہلے روپیہ پیسہ خاطر خواہ ملتا تھا۔ اب تادیباً ہاتھ کھینچا جانے لگا۔ یہ دیکھ کر میں نے قرض، چوری، دغا بازی، فریب کے آگے ہاتھ پھیلا دیا۔ اسی طرح جوان ہوا تو بے ایمانی، ظلم، ناعاقبت اندیشی، نخوت، شرارتیں میرے ساتھ جوان ہوئیں۔ بے ادبی، جہالت، بدمستی، اور بُری صحبتوں سے تو دلی لگاؤ تھا ہی تھوڑے ہی دن میں پنج عیب شرعی کے علاوہ دنیا بھر کے بُرے فعلوں میں طاق ہو گیا اور ہر گناہ کے لئے مجھ میں ایسی حیرت ناک جرأت خود بخود پیدا ہو گئی کہ ایسی کبھی میرے خیال میں بھی نہیں آسکتی تھی۔

محنت مشقت کس جانور کا نام تھا۔ آپ سے آپ موٹا مُشٹنڈا ہونا چاہئے تھا۔ چنانچہ جوانی کے زور بل کو حظ نفس مطلب براری۔ دھینگا

مشتی اور مشت مشت میں صرف کیا۔ رفتہ رفتہ شورہ پشتی اختیار کی اور اک اچھے خاصے جتھے کا سرغنہ بن گیا۔ اب کیا تھا کڑوا کریلا نیم چڑھا وہ اور بھی کڑوا ہو گیا۔ اب گناہوں کی کیا کمی تھی جس وقت چاہتا تھا اور جو چاہتا کر بیٹھتا تھا۔ خوف خدا میرے دل میں سے اس طرح اُڑ گیا جس طرح منافق کے دل میں سے نور ایمان۔ اپنی کوئی چیز میری نظر میں اچھی نہیں معلوم ہوتی تھی یہاں تک کہ میری بیوی مجھے بُری معلوم ہونے لگی۔ میری نگاہیں بالکل ناپاک ہو گئیں۔ حظِّ نفس کے لئے بڑے بڑے گناہ مثلاً چوری ڈاکہ اور قتل انسان میرے لئے کھیل ہو گئے۔ سینکڑوں دل میں نے دکھائے۔ جھوٹی گواہیاں میں نے دیں۔ آپس میں لڑائیاں میں نے ڈلوئیں۔ حلال حرام میں مجھے تمیز نہ رہی۔" لوگوں کے حق میں نے چھین لئے جن سے جانوروں کو بھی شرم آتی تھی وہ ناجائز ظالمانہ برتاؤ میں نے کئے حتےکہ غریبوں کے گلے کاٹ ڈالے۔ عورتوں کو بیوہ۔ بچوں کو یتیم بیکس و بے خانماں بنا دیا۔ ان مظالم اور شرمناک واقعات سے کیا ہوا؟ یہ ہوا کہ وہ محبت بھری نگاہیں جو چھٹپن میں میری بھولی بھالی صورت پر اکثر قربان ہوا کرتی تھیں۔ اب ان میں زہر بھر گیا تھا اور جب کوئی مجھے دیکھتا تھا گویا ان آنکھوں میں خون اُتر آتا تھا۔ رات دن اپنے سامنے میں دنیا کو مرتے دیکھتا مگر اپنی موت کا مجھے کبھی خیال بھی نہ آتا تھا۔ کہ گویا موت اوروں ہی کے لئے بنائی گئی تھی اور میں اُس سے بالکل آزاد تھا۔ میں خدا کے بندوں کو اپنا محکوم بادشاہ وقت کو اپنا ہمعصر اور پرائے مال کو اپنی ہی ملکیت سمجھتا تھا۔ اُن طاقت ور ہاتھ پاؤں پر مجھے بڑا ناز تھا جو فطرتی طور سے قوی اور میرے سب گناہوں میں شریک رہا کرتے تھے مگر خدا جانے یہ کیا بات تھی کہ باوجود تمام بے باکیوں کے میرا ہزار دفعہ کا تجربہ ہے کہ میں جب کبھی کسی چھوٹے سے چھوٹے یا بڑے سے بڑے گناہ کا قصد کرتا تھا تو میرے اُسی دل میں سے جو اب کثرت جرائم

سے بالکل سیاہ ناکارہ ۔ فولاد سے زیادہ سخت اور گندہ ہو گیا تھا خود بخود یہ لفظ کوئی کہتا ہوا سنائی دیتا تھا کہ اور و سیاہ! بدبخت! کیوں اپنی جان پر ظلم کرتا ہے۔ کیوں جہنم میں گھر بناتا ہے ظالم! خدا کے غضب سے ڈر اور پہلے اُس بوجھ کو ہلکا کرے جواب کوئی دم جاتا ہے۔ تیری گردن توڑ ڈالے گا آہ اُس وقت میں سخت پریشان ہو جاتا تھا۔ بھونچکا ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگتا تھا کہ یہ کس کی آواز ہے مگر کوئی کہنے والا انسانی صورت میں نہیں دکھائی دیتا تھا۔ اور میں پھر اپنی عادت کے موافق گناہوں کی لمبی چوڑی فہرست میں جسے لکھتے لکھتے لکھنے والا بھی عاجز آگیا ہوگا اک اور اضافہ کرنا چاہتا تھا۔ اور پھر مجھے وہی صدائے مہیب آنے لگتی تھی۔ جس سے کبھی کبھی میرے تن بدن میں رعشہ بھی ہو جاتا تھا مگر افسوس ہے کہ کہنے والا تو گناہ کے اختتام تک برابر اُسی لب و لہجہ میں مجھے ملامت کئے جاتا تھا اور میں مساوات میں پڑ کر اُس کی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ یہاں تک کہ آخر وہ نہ ٹلنے والی گھڑی وہ انمٹ ہونی شدنی ۔ وہ جس سے ہر منٹ ہر ثانیہ کے بعد دنیا میں ایک بڑی تعداد جانوروں کی اپنے قالب چھوڑ دیتی ہے گدا سے لے کر شہنشاہ تک جس سے عاجز ہیں اور جس کے گذشتہ سال ۱۹۰۱ء میں جنوری کی بیسویں کو شام کے سات بجے کچھ منٹ پر قیصرۂ ہند ملکہ معظمہ کو باوجود کروڑ ہا جانوں پر قابض ہونے۔ دنیوی اعتبار سے جواہرات میں تلنے ہزار ہا میل مربع تر و خشک پر حکمران کہلانے اور منتخب روزگار ڈاکٹروں کی موجودگی کے بھی ایک پلک نہ مارنے دی یعنی موت! میرے سر پر بھی آگئی۔ اب میری آنکھیں کھلیں کہ میں کون تھا۔ کس لئے بنایا گیا تھا۔ اور میں نے یہاں آکر کیا کیا۔ آہ! میرے دوستو! یہ آخری لفظ اب میری زبان سے نہیں ادا ہوتے میرے وہ عمر بھر کے رفیق جن کے بھروسے اور قوت پر جن کے خوش رکھنے اور آرام دینے کے لئے جن کی زیبائش کے واسطے

جنہیں تر و تازہ رکھنے کی غرض سے تمام بداعمالیوں کی پوٹ میں نے اپنے سر پر رکھ لی تھی ایک ایک کر کے مجھ سے جُدا ہونے لگے اور مجھے یادداشتِ اعمال کے لئے تنہا چھوڑ دیا آنکھیں بے نور ہوگئیں کان بہرے ہوگئے۔ ہاتھ پاؤں سُست پڑ گئے حواس جاتے رہے دم رُکنے لگا اور کسی نے سر سے لے کر پاؤں تک رگ رگ میں سے سانس نکال لیا۔ اب وہ ظالم اور وہ میرے اپنے ہاتھوں کے بوئے ہوئے کانٹے یعنے وہی شرمناک عبرت انگیز واقعات جو میری ساری ناپاک زندگی میں ظہور پذیر ہوئے تھے سب یکے بعد دیگرے میرے سامنے آنے لگے۔ دنیا کا وہ تمام مال جو میں نے ہزار جھوٹ سچ۔ پھند۔ فریب اور خون ریزیوں سے جمع کیا تھا سب کا سب نہایت حسرت کے ساتھ دوسروں کے لئے چھوڑنا پڑا۔ ان ستم رسیدوں کے مُردہ جسم جن کے گلوں میں پھانسیاں ڈال ڈال کر میں نے زبردستی لٹکا دیا تھا۔ ایڑیاں رگڑتے دم توڑتے جنہیں دیکھتا تھا۔ پھر اُنہیں مہیب صورتوں میں گویا میری چھاتی پر چڑھے آتے تھے۔ وہ عورتیں جن کو میں نے ستایا تھا وہ معصوم بچے جنہیں میں نے یتیم بنایا تھا انتقام کی تیز چھُریاں لئے ہوئے میری آنکھوں میرے پہلوؤں میں بھونکنے کے لئے دوڑے چلے آتے تھے۔ بیسیوں ہاتھ تھے جو میری طرف بڑھ رہے تھے سینکڑوں کرخت اور ہولناک آوازیں تھیں جو مجھ پر یورش کر رہی تھیں ان سب پر طرّہ سب سے زیادہ خطرناک جو نظارہ تھا جسے دیکھتے ہی میرے پاؤں کے نیچے کی زمین نکل گئی میرا کلیجہ شق ہوگیا اور میرے سخت دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے وہ یہ تھا کہ ملک الموت کا زبردست ہاتھ میری گردن پر تھا۔ فرشتگان عذاب مجھ پر مسلّط تھے قہر خدائے قہار جوش زن تھا اور دوزخ میرے لئے منہ کھولے ہوئے تھا آہ آہ! کاش اس سے پہلے چلتے ہاتھوں میں کوئی نیک کام کر گذرتا۔ او ظالم خود بخود برباد ہو جانے والے!

اور اپنے ہاتھوں اپنے پاؤں میں کلہاڑی مارنے والے! او غرور کے پتلے۔
او خود غرضیوں کے دیوانے او لالچ کے دیوتا۔ او بے بنیاد کائنات اس وقت
تو اس رحمت اللعالمین کی خدمت میں سر نیاز جھکا دے۔ اس وقت تو
رجوع قلب سے دو آنسو نکال کر نجات کا طالب ہو جا۔ آہ آہ تو تو سب کچھ
کرے مگر افسوس ہے کہ اب وقت نہیں رہا۔ گناہوں کی دلچسپی نے تجھے کہیں
کا نہیں رکھا اے بدنصیب بندے اب کچھ نہیں ہو سکتا۔

آغا شاعر قزلباش دہلوی

طوفان نوح

بعض الفاظ میں کچھ ایسا چلتا جادو ہوتا ہے کہ زبان سے نکلتے ہی دلوں کو مسخر کر لیتا ہے اور نظروں کے سامنے زمانہائے گذشتہ کا مرقع لا حاضر کرتا ہے جو الفاظ زیب عنوان ہیں ایک تاریخی واقعہ کی یاد دلا دلا کر بدن پر رونگٹے کھڑے کر رہے ہیں آہ۔ تاریخی واقعہ بھی کیسا عبرت ناک اور جگر خراش جس کے بالین پر حسرت و یاس کی گھنگھور گھٹائیں تلی کھڑی ہیں اور جن کے سایہ میں زمانہ ماضی کھڑا ہوا ڈاڑہیں مار مار کر فاتحہ خوانی کر رہا ہے آؤ! قوتِ متخیلہ کی مقراض سے صدیوں کے گریبان کو چاک کریں اور دیکھیں کہ اس واقعہ کی ابتدا کیونکر ہوئی اور انجام کیا ہوا۔

ایک جلیل القدر روحانی ڈاکٹر اپنی قوم کو امراض مہلکہ اور مزمنہ میں گرفتار پاتا ہے اور اُن کی ردّی حالت دیکھ دیکھ کر کڑھ رہا ہے دفعیہ امراض کے لئے نسخوں پر نسخے تجویز کر رہا ہے مگر قوم آہ! بدنصیب قوم بادہ فنا میں سرشار جامِ بقا پینے سے انکار کر رہی ہے۔ تازیانۂ قہر خدا خوف دلاتا ہے اور نہیں مانتی۔ عذابِ آخرت کا فوٹو کھینچ کھینچ کر دکھار ہا ہے اور مطلق پرواہ نہیں کرتی خوشامد کرتا ہے۔ اور ہنس ہنس کر ٹال دیتی ہے لعنت۔ ملامت سے کام لیتا ہے اور قوم کانوں میں تیل ڈالے بیٹھی ہے۔ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ آخر علاج کرتا کرتا مایوس ہو جاتا ہے اور درگاہ قاضی الحاجات میں اس طرح مناجات کرتا ہے کہ بارالہا ہماری قوم کی حالت سقیم ہے اے معبود حقیقی گواہ رہ کہ میں نے تبلیغ احکام میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اب اس قوم کی شقاوت اور ضلالت دیکھی نہیں جاتی اے قہار اپنا قہر اس قوم

پر نازل کرتا کہ یہ بھی اپنے کیے کا مزا چکھے۔

دعا قبول ہوئی پانی چڑھتا چلا آتا ہے۔ دریا پھیل پھیل کر جھیلوں سے جا ملے جھیلیں اُبل اُبل کر سمندر سے ہمکنار ہو گئیں۔ سمندر نے بھی ہاتھ پاؤں نکالنے شروع کر دیئے۔ سرسبز میدانوں کو تاخت تاراج کرتا اِس قوم سیاہ کار کا تعاقب کئے چلا جا رہا ہے ان بدبختوں نے زمین پہ کوئی جائے امن نہ پائی تو پہاڑوں کی راہ اختیار کی۔ جہاں درندے ان سے پہلے ہی سہمے ہوئے کھڑے ہیں اور کچھ ایسے حواس باختہ ہیں کہ اُن کی طرف نظر اُٹھا کر نہیں دیکھتے۔ پانی ہے کہ برابر اُٹھا چلا آ رہا ہے انسان حیوان سب اپنی اپنی جانوں کو بچانے کے لئے اوپر چڑھتے چلے جا رہے ہیں اَب موقعہ بہت نازک آپہنچا اجل سر پر منڈلا رہی ہے چپہ چپہ جگہ پر انسانوں اور حیوانوں میں کشت و خون ہو رہا ہے اب تمام مکانات درخت ٹیلے اور پہاڑیاں غرق ہو چکے۔ صرف بلند پہاڑوں کی خال خال چوٹیاں سطح آب سے کسی قدر بلند نظر آتی ہیں بجلی چمک رہی ہے بادل برابر گرج رہا ہے مینہ ہے کہ موسلا دھار برسے چلا جاتا ہے سمندر اُچھل اُچھل کر خانماں خرابوں کا شکار کئے جا رہا ہے۔ لو غضب ہو گیا اب تو اُن سر بفلک چوٹیوں پہ بھی پانی پھر گیا۔ کہاں ہیں ایلپس کی بلند چوٹیاں کہاں ہیں کوہ انڈیز اور کوہ ہمالیہ کے عالیشان پہاڑ جو نہایت نخوت سے اپنے سروں کو بلند کئے کھڑے تھے۔

اب پانی کا چڑھنا بند ہو گیا سمندر احکام ایزدی کی تعمیل کر چکا جس طرف نظر اٹھا کر دیکھو ایک بحر ناپیدا کنار ہے کہ سائیں سائیں کر رہا ہے۔ موالید ثلاثہ میں سے کوئی اس عظیم الشان بربادی پر آنسو بہانے والا نہ رہا سمندر کی لہریں تمام دنیا کا چکر لگا رہی ہیں اور کوئی سدِّ راہ نہیں پاتیں۔ اس خوفناک سین کو دیکھ دیکھ کر ہمارے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوئے جاتے ہیں چھوٹے چھوٹے بچوں اور ننھے ننھے شیر خواروں کی لاشیں پانی پہ بہتی

چلی جا رہی ہیں جن کی بھولی بھولی صورتیں دیکھ دیکھ کر کلیجہ منہ کو آجاتا ہے آہ! یہ ننھا سا بچہ جس پر معصومیت کھڑی رو رہی ہے کن کن نازوں کا پلا ہوا ہوگا۔ اِن جھنڈولے بالوں کو جو سطح سمندر پر پریشان ہو رہے ہیں کس پیار سے اس کی ماں سلجھاتی ہوگی۔ یہ حسرت و یاس کی تصویر منہ میں انگوٹھا لئے خویش واقارب سے دور دنیا و مافیہا سے بے خبر جان شیریں موت کے حوالے کئے موجوں کے گہوارے میں جھولتا چلا جا رہا ہے اے خدائے بزرگ برتر کہاں ہے تیرا رحم۔ کیا تیرا قہر تیرے رحم پر غالب ہے نہیں نہیں ہرگز نہیں پھر رحم کو ہم کہاں تلاش کریں!

وہ دیکھو وہ کشتی جس کا ناخدا نظر نہیں آتا جس کو ملائکہ مقربین کھے رہے ہیں اور جس پر رحمت ایزدی اپنا سایہ ڈالے ہوئے ہے موجوں کی تاریکی کو چیرتی پھاڑتی کس شان و شوکت کے ساتھ اس بحر مواج پر سوار موجوں کے گھونگٹ میں اُڑی چلی آ رہی ہے اس سے زیادہ قیمتی مال کسی جہاز میں آج تک نہیں لادا گیا اور نہ آئندہ لادا جائے گا۔ دین حق کے رہنما آئندہ نسلوں کے باوا آدم اس پر سوار ہیں اس خوفناک وحشت کے سین کو طے کرتی کشتی فراٹے بھرتی چلی جا رہی ہے کہ یکایک پیندے سے رگڑ کی آواز پیدا ہوئی اس آواز کو سنتے ہی کشتی کا دروازہ کھلتا ہے اور اس میں سے یکے بعد دیگرے اس کشتی کے راکب باہر آ کر سر عجز خاک نیاز پر رکھ کر اس ذات پاک کا شکر بجا لاتے ہیں جس نے اپنی رحمت کاملہ سے اُن کو اس طوفان عظیم سے نجات دی +

سید شریف حسین

مُوزِ حیات

اِس مضمون میں ہمیں اُن قوائے اندرونی سے بحث کرنی ہے جن کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے اور برتنے سے اِنسان کے لئے ہر جائز ترقی کا دروازہ کھل جاتا ہے اور زندگی قابل قدر و شکرگذاری بن جاتی ہے۔ خیال کو معلومات حیات انسانی میں بہت بڑا دخل ہے۔ حتیٰ کہ اکثر صورتوں میں بہت کچھ زندگی خیالات ہی کے نتائج سے مرتب ہوتی ہے۔ اگر خیالات کا اُبال کسی اصلی اور صحیح مادہ کے جوش کھانے کا نتیجہ ہے تو اِنسان کی زندگی نہایت صحیح اور پائدار اصول پر قایم ہوگی۔ اگر اس کے برعکس ہے تو نتیجہ بھی برعکس ہوگا کسی صحیح مادہ کی تحریک اولی جو قلب اِنسان میں پیدا ہوتی ہے اُسے ایمان کہتے ہیں۔ اِس کی تفصیل اور پھیلاؤ کا نام عقائد ہے اور یہ دونوں مل کر خیال پر جو اثر پیدا کرتے ہیں اور پھر خیال کے زیر سایہ جس طرح زندگی مرتب ہوتی ہے اُسے اعمال سے تعبیر کیا جاتا ہے صحت اور اصلیت قلب کی تہ میں ہے اور جب اس میں تحریک پیدا ہوتی ہے تو اُس کا نشانہ قلب کی چاندماری پر جا لگتا ہے اور وہاں سے کل دار و گیر شروع ہوتی ہے۔ اب سب سے پہلے یہ پتہ لگانا چاہیئے کہ اصلیت یا صحت اپنی ذات میں ہے کیا شئے اور جب اُسی کے متحرک ہونے سے دنیا میں ہر عمدگی اور خوبی کا وجود ہے تو وہ ذرائع کیا ہیں۔ جن سے وہ تحریک میں آسکتی ہے

ساری دنیا کی جان بلکہ جان کی بھی جان۔ ہر سطح کا عمق بلکہ عُمق کی تہ یک ذات واحد ہے جس میں وہ کل جوہر مضمر ہیں جو عالم عرض و سبب میں ظہور پذیر ہو کر آفرینش و بقاء و فنائے کائنات کے قواعد کا کلیہ ہیں۔ ذات ہر شے میں

ساری وطاری ہے اور انسان جو بدرجہ اکمل مظہر ذات ہے صرف اسی وجہ سے اُن سب اسباب پر قادر ہے جو ذات کے جلو میں کام کرتے ہیں اُنہی اسباب کو آفرینش وبقاء وفناء کائنات کے قواعد کا کلیہ کہنا چاہئے اور انہی کی مکمل فہرست بنانا ان کو اچھی طرح سمجھ لینا اور اُن کا رخ دیکھ کر کام کرنا انسان کو اشرف المخلوقات کے لقب کا مستحق کرتا ہے۔ اگر ذات یکتا ویکساں نہ ہوتی تو دنیا میں کوئی کلیہ قایم نہ ہو سکتا۔ سوسائیٹوں اور افراد میں یکتائی اور یکسانیت کا خیال ہی نہ پیدا ہوتا اگر ذات معطل محض ہوتی اور اُس کے جلو میں متذکرہ بالا اسباب نہ ہوتے تو کوئی شخصی زندگی اس سے گرمی پاکر نشوونما نہ پکڑ سکتی۔ کل عالم میں یہ چلت پھرت نہ ہوتی اور ایک ایسی حالت ہوتی جسے سکون محض کہنا چاہئے یہ حالت باعتبار مشاہدہ بھی محال ہے اور یہ بات کہ انسان ترقی کرتا ہے اس بات کا ثبوت ہے کہ متصرف ہے اور ذات کا متصرف ہونا انسان کے لئے ترقی کو لازمی کرتا ہے۔ یہ اس کا ثبوت ہے وہ اُس کا۔

اس بیان سے معلوم ہوا کہ اصلیت یا صحت ذات ہے اور اس کی تحریک اور لے ترقی ہے جو انسان کا ایمان ہے۔ نیز یہ کہ ترقی کا مرکز انسان میں ہے نہ کہ اُس سے باہر ہے ؎

کہیں تجھکو نہ پایا گرچہ ہم نے اک جہاں ڈھونڈا
پھر آخر دل ہی میں دیکھا بغل ہی میں سے تو نکلا

اس کے بعد اُن اسباب کی توضیح ہونی چاہئے جو نظام عالم کے کلئے ہیں۔ اور یہ دیکھنا چاہئے کہ خود انسان میں کیا کیا قوے ہیں جو ان اسباب سے دست وگریباں ہو سکتے ہیں۔ اسباب کو ڈھونڈنا اور اُن پر تسلط کرنے کے قابل جو قوے ہیں ان کو باہر نکال کرنا صحیح مادہ کو تحریک میں لانا ہے۔ اس کام کو انجام دینے کا صرف یہی کامل ذریعہ ہے خلاصہ یہ ہوا کہ ترقی کرنا تو دین ایمان ہی ٹھہرا صرف یہ دیکھنا باقی ہے کہ کن کن باتوں میں ترقی کرنا ہے اور

اس کے ذرائع ہم میں کیا موجود ہیں۔ کل کائنات کی بنا اور گویا آفرینش کی اصلی رمز محبت ہے اس چاشنی سے یہ کل قوام تیار ہوا ہے۔ اس دعوے کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ شخصی زندگیوں میں مقابلہ اور اجزا کے یہ جزو بہت زیادہ عام اور دخیل ہے۔ بنیاد اس کل تماشا گاہ کی محبت ہے۔ اس کے قیام میں عدل کا تصرف ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر جاندار ناواجب سختی سے گریز کرتا ہے اور غلام تک اپنے دل میں عدل کا امیدوار ہوتا ہے اس کے قیام کے لئے ہمت کا ضامن دیا گیا ہے۔ اور کُن فیکون سے لے کر آج تک بغیر صرف ہمت کے کوئی گاڑی نہیں چلی اور نہ آیندہ چلے۔ محبت۔ عدل اور ہمت نظام عالم کے اصلی اور زبردست کلیے قرار دیئے جا سکتے ہیں باقی جو کچھ ہے وہ ان کے فروعات ہیں اور ہر صاحب ایمان یعنے ترقی کرنے والے انسان کا فرض ہے کہ ان اجزاء کے عمل کو محسوس کرے اور خیالات پر اُن کا پورا اثر دے۔ باعتبار اس کے کہ یہ قواعد عالمگیر ہیں ہر زندگی اُن سے یکساں متاثر ہوتی ہے اور جہاں کہیں نتیجہ برعکس دکھائی دیتا ہے ضرور ہے کہ کچھ موانعات ایسے حایل ہوں جو ان کے اثر کو باطناً محسوس نہیں ہونے دیتے۔ ان اجزا کی کارپردازی کو بدرجہ اکمل اور بے حجاب اپنے میں دیکھنا اور رشتہ اُن کا اپنے منبع یعنی بحر ذات سے ہے اُسے بے کم و کاست پہچان لینا اعلےٰ مقصد حیات ہے۔ عالم اندرونی میں یہ اجزاء ایمان۔ عقائد خیالات اور ارادوں کے لباس میں جلوہ گر رہتے ہیں عالم بیرونی میں بھی اور صرف یہی اپنے اپنے موقع اور محل پر عملاً ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ بہرحال خلوت اور جلوت دونوں میں انہی کا تصرف ہے اور چونکہ یہ خود ذات سے قوت پذیر ہیں اس لئے هُوَ الظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ دین و ایمان ٹھہرا۔

ہمارا ترقی کرنا یہی ہے کہ ہم میں محبت بڑھے۔ عدل دستور العمل بنے اور ہمت ہر وقت ہماری سربراہی کرتی رہے۔ جہاں تک اُن کا تعلق ہم سے

اندرونی طور پر ہے ہم اُن کے معاملے میں قوائے باطنی سے کام لیں اور جہاں یہ بیرونی شائبہ زندگی سے وابستہ ہیں وہاں قوائے ظاہری سے اُن کا عمل درآمد کیا جاوے اس بارہ میں کامیاب ہونے کے ذرائع ہم میں یہ موجود ہیں کہ سب سے پہلے تو یہی ہمارا ایمان ہے کہ ہم ترقی کے موضوع اصلی ہیں۔ اور مبدءِ فیاض جس کے پرتوفیض سے محبت عدل اور ہمت قائم ہیں۔ ہمارے لئے بنا بنایا آیڈیل[1] زندگی کا موجود ہے بلکہ وہ آیڈیل خود ہماری زندگیوں میں جلوہ گر ہے۔ ہمیں بفحوائے إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً۔ صرف اسے بدرجہ اولٰے ظہور میں لانا ہے اِس اندرونی یقین کے بعد صرف یہ کرنا باقی ہے کہ آیڈیل کو جس قدر زیادہ ہوسکے سامنے رکھیں۔ خود وہ دل میں ایک کریدنی پیدا کر دے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ترقی کے اسباب خارجی بھی سب مہیا ہو جائیں گے۔

یہاں تک تو اصولی بحث تھی۔ اب ہم ذرا بدیہات میں آکر یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ ہم مسلمانانِ ہند کو محبّت۔ عدل اور ہمت کی کس طرح جلا کرنی چاہیئے اور زمانہ کی رفتار اور ضرورت کے موافق اُن سے کیا کام لینا چاہیئے۔ ہماری جو موجودہ حالت ہے اور جس میں بیّن ترقی نہ ہونے سے خدا کی زمین و آسمان ہم پر تنگ ہوتے نظر آتے ہیں۔ ضرور فطرت کے مقررہ قواعد کے تحت میں ہے۔ انہی قواعد کی رو سے ہم پستی میں ہیں انہی قواعد کے موافق ہم ترقی کر سکتے ہیں ہمارا تنزل اسی وجہ سے ہے کہ ہم نے فطرت کے عالمگیر قواعد کے خلاف کاروائی کی محبتوں کو منتشر اور ضعیف کر دیا عدل سے منہ موڑ لیا۔ اور ہمت کو زنانہ لباس پہنا دیا۔ ترقی کرنے کی یہی صورت ممکن ہے کہ محبتوں کو مجتمع کر کے اصلاحِ قوم کی جانب رجوع کریں۔ عدل کی تعمیل میں حقوق اللہ وحقوق العباد

---

[1] یہ لفظ اُن انگریزی الفاظ میں سے ہے جن کا اُردو میں صحیح ترجمہ ہونا قریباً محال ہے اس کا مفہوم ہے مقصدِ اعلےٰ ۱۲

کو پہچانیں اور اُس کے موافق عمل درآمد کریں اور سب سے بڑھ کر ہمت اور بلند حوصلگی کی ہر اس رمق کو جو ہم میں ہے متحرک کر کے فلاح اور بہبود قوم میں صرف کریں میری رائے میں ہر مسلمان کو تجدید ایمان کرنا چاہیئے اگر اب تک کسی نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تھوڑی سی حسب عادت اور مثل ایک کل کے عبادت کر لینا اور ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے پستی کی حالت میں پڑا رہنا نجات کے لئے کافی ہے۔ اور خدا اور اُس کا رسول ہم سے راضی ہے تو جہاں تک جلد ممکن ہو اس مغالطے سے اپنے آپ کو نکالنا چاہیئے ہم دکھا چکے ہیں کہ انسانی فرض منصبی ترقی کرنا ہے ہر مسلمان کو اس پر ایمان لانا چاہیئے کہ میں اسی صورت میں نجات کا مستحق ہوں جب میں حسب منشاء خدا اور رسول کی ترقی کروں ایک زمانہ وہ تھا کہ خدا اور رسول کی خوشنودی کے لئے مسلمانوں کو ترقی حاصل کرنے کے راستہ میں جانیں دینی پڑتی تھیں۔ مال لٹانے پڑتے تھے۔ بے گھر۔ بے در ہونا پڑتا تھا۔ اللہ کا احسان ہے کہ ہم مسلمانانِ ہند کو ان سخت آزمائشوں میں سے ایک کا بھی سامنا نہیں کرنا ہے۔ ہمیں تو گنی چنی یہ دو تین باتیں کرنی ہیں کہ دل سے خدا اور رسول کی خوشنودی اپنی اصلاحِ حال میں تسلیم کر کے گورنمنٹ کی وفاداری۔ ترقی تعلیم۔ تحفظ قوائے اور کفایت شعاری پر ٹوٹ پڑنا چاہیئے۔ صرف محبت کے لئے ہمارے سامنے ایک بڑا وسیع میدان غریب بیکس ناسمجھ جاہل مسلمانوں کا ہے تھوڑی سی توجہ۔ خدا ترسی اور منکسر المزاجی سے ہمیں اُن کے ساتھ محبّت اور ہمدردی پیدا ہو سکتی ہے۔ تصویریں تو پہلے مسلمانوں میں ہوتی نہ تھیں اور ہوتی بھی تھیں تو خال خال۔ مگر خدا کے ناموں۔ اچھے اقوال پاکیزہ اشعار وغیرہ کے طغرائے اور قطعات اکثر ذی استطاعت لوگوں کے کمروں میں لگے ہوئے ہوتے تھے۔ مطلب یہ تھا کہ وہ چیزیں وقتاً فوقتاً نیکی کی طرف مائل کرتی رہیں۔ اب جو زمانے کی ضرورت کے موافق ہماری نیکیوں کی فہرست از سر نو مرتب ہوئی ہے تو ہمیں چاہیئے کہ اس

فہرست کو مختلف صورتوں میں اپنی پیش نظر رکھیں۔ قطعوں میں۔ طغروں میں ساری تحریروں میں۔ تصویروں میں۔ الغرض جس طرح ہو سکے وہ فہرست ہماری آنکھوں کے سامنے رہے کہیں یتیموں کی طرف متوجہ کرنے کا کوئی سامان ہو۔ کہیں قوم کے جہل و تعصب کا رونا دل نرم کرنے کے لئے موجود ہو۔ کہیں فضول خرچی کی ڈراؤنی صورت دل دہلا دے۔ کہیں بے دینی کا مرقع خون کے آنسو رلا دے دیکھیں کب تک اثر نہیں ہوتا۔ بادی النظر میں اس بات پر ہنسی آئے گی مگر یہ کرنے کی بات اور اصلاح قلب کے مسلّم طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے۔ میں صرف ذرا نیا رنگ دے کر عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ بعض اوقات خالی الذہن ہو کر اور اکیلے میں بیٹھ کر قلب کی طرف متوجہ ہو کر ترقی تعلیم تحفظ قوا ے، کفایت شعاری وغیرہ وغیرہ الفاظ کا ورد کرنا چاہئے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد اپنی عادت کے موافق دل اور چیزوں کو خود اپنے میں جگہ دے دے گا۔ جب ایک دفعہ دل میں بس گئیں تو پھر ظہور میں آنا کیا مشکل ہے۔ ایک بڑی عمدہ ترکیب دماغ و قلب کو صحیح رکھنے اور صحیح کاموں کی طرف متوجہ کرنے کی یہ ہے کہ عمدہ چیزوں۔ عمدہ کاموں۔ عمدہ لوگوں کی تعریف اکثر کرتے رہنا چاہئے۔ اس ترکیب کا سریع التاثیر ہونا اور اس کے فوائد دو چار ہی دن کے تجربہ سے واضح ہو سکتے ہیں فرض کیجئے کہ صبح کے وقت ایک شخص نے پندرہ منٹ یا آدھ گھنٹہ کسی اچھی چیز یا اچھی بات یا اچھے کام کی تعریف میں گذارا اور بعد میں اپنے معمولی دنیاوی مشاغل میں مصروف ہو گیا تو تقریباً چھ سات گھنٹہ کے بعد اس پر خود بخود پندرہ بیس منٹ کے لئے ایسی حالت طاری ہو گئی جس میں وہ اپنے آپ کو بہت سی قیود سے آزاد سمجھے گا اور ترقی کرنے کے لئے مستعد و تیار پائے گا۔ برعکس اس کے اگر کسی بری اور نفرت انگیز چیز کے متعلق وقت صرف کیا ہے اور بیزاری اور غصہ پیدا ہوا ہے۔ تو وہی سات آٹھ گھنٹے کے بعد پستی کا ایک حملہ ہو گا۔ جس میں وہ شخص اپنے تئیں

بہت سی باتوں سے مجبور، مظلوم اور مقید تصور کرے گا۔ اور یہ سب ترقی کے دشمن جانی ہیں ان عملی تجاویز سے جو صرف بذریعہ قوائے اندرونی ہم کام میں لا سکتے ہیں بہت سے ایسے موانع دور ہو جائیں گے جو ہمیں پست ہمت کرتے ہیں اور طائر ترقی بہت کچھ بلند پروازی کرنے لگے گا۔ زندگی میں عملی پاکیزگی پیدا کرنے کی ایک اندرونی تدبیر یہ ہے کہ ماں بہن۔ بیٹی یا مثل ان کے متبرکات کا خیال اکثر دل میں رکھنا چاہیئے اور اُن کے حق میں دعا کرنی چاہیئے۔ دعا کے معنے ہیں قلب کو متحرک کرنا کسی ضروری خیال کے متعلق آپ بھی دعا کیجیئے کہ یا اللہ ہمیں تعلیم سے بہرہ ور کر جس قدر باطن میں منفعل ہو کر دعا مانگیئے گا اسی قدر قلب اس سے متاثر اور چاشنی یاب ہوگا۔ اور اُس پر ملمع چڑھا اور عمل کی توفیق ہوئی صحت کے لیئے اطبا طبیں غذائیں دوائیں حسب ضرورت ہر شخص استعمال کرتا ہے مگر ایک ہلکا سا نسخہ ہم بتائیں۔ اگر ماءالحم انگوری دو آتشہ کا کام نہ دے تو جبھی کہنا ہنس کر نہ ٹال لیئے۔ اور صرف آٹھ دس دن استعمال کر کے دیکھیئے وہ یہ ہے۔ کہ کھانے سے ۵ منٹ بعد تک طبیعت کا رُخ عبادت آمیز رکھیئے اور ایک شکر گذاری کی کیفیت اپنے اوپر طاری رکھیئے۔ پھر دیکھیئے کہ دل و دماغ کیا جلا پاتا ہے۔ اور صحت کیسی عمدہ رہتی ہے۔ اوّل اوّل ان مشقوں کا کرنا ذرا شاق اور بے پھل معلوم ہوتا ہے۔ مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد اُن سے فیضیاب ہو کر زبان حال سے یہ شعر نکلتا ہے ؎

سالہا دل طلب جام جم از ما میکرد ۔۔۔ آنچہ خود داشت زبیگانہ تمنا میکرد

ہمیں سب کچھ معلوم ہے۔ اپنی پستی معلوم ہے اوروں کی ترقی معلوم ہے۔ مذہب کے برکات سے واقف ہیں۔ گورنمنٹ کے احسانات سے دن رات فیض یاب ہوتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ہمیں کن کن چیزوں کی ضرورت ہے اور اُن کے حاصل کرنے کے قواعد کیا ہیں کمی صرف اس بات کی ہے ہماری عملی قوت اس قدر نہیں جس قدر ہونی چاہیئے۔ ایک ترکیب تو عملی قوت کے بڑھانے کی

یہ ہے کہ تقریروں۔ لکچروں اور مضامین سے قوم کو جگایا جاوے یہ جب سے شروع ہوا قوم دن بدن سنبھلتی جاتی ہے میری ساری کوشش اس مضمون میں اس بات کے پیش کرنے کی ہے کہ اندرونی قوائے عملیہ کی طرف بھی توجہ کرنی چاہئیے فرض کیجئے کہ ایک شخص کے خیالات منتشر رہتے ہیں اور وہ کوئی اچھا کام جس کے لئے یکسوئی درکار ہے نہیں کرسکتا۔ ہم اُسے ایک کتاب پڑھاتے ہیں جس میں انتشار کی برائیاں۔ یکسوئی کی تعریفیں وغیرہ لکھی ہوئی لکچر سناتے ہیں ترغیب دلاتے ہیں اُن لوگوں کی مثالیں پیش کرتے ہیں جن کو انتشار سے نقصان پہنچا اور جو یکسوئی کی بدولت فایز المرام ہوئے۔ ان سب کوششوں سے ہم اس میں ایک جھر جھری پیدا کرتے ہیں۔ اور ایک حد تک کامیاب بھی ہوتے ہیں۔ ان کو ہم بیرونی تدابیر سے تعبیر کرتے ہیں۔ اب انتشار رفع کرنے اور یکسوئی پیدا کرنے کے لئے اندرونی ذرائع بھی ہیں جو ان بیرونی تدابیر سے مستغنی ہیں اور ان سے بدرجہا زیادہ سریع الاثر ہم اسی آدمی کو فوراً چند ضروری قواعد روزمرّہ کی زندگی کے بتاتے ہیں اور یہ کہ وہ اپنے اندرونی قوائے سے کام لے۔ دن رات میں صبح و شام مگر زیادہ تر صبح کا وقت نیچر کے سکون کی حالت میں ہونے کا ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں اس شخص کو چاہئیے کہ تنہائی میں تھوڑی دیر بیٹھ کر خاموشی کے ساتھ کوئی ایک لفظ ایک فقرہ ایک خیال لے کر اس پر غور کرے اور پھر چھوڑ کر اپنے اور کاموں میں مصروف ہو پھر دوسرے روز ایسا ہی کرے۔ اور اسی طرح چند روز کرتا رہے۔ یکسوئی کی عادت ہو جائے گی۔ محض مبتدی کے لئے سب سے آسان ترکیب یہ ہے کہ سانس کی ضربوں کو گنے سانس ایک ہلکی سی ضرب نیچے دیتا ہے ایک اوپر۔ ان کی طرف توجہ کرے۔ رفتہ رفتہ یکسوئی پیدا ہو جائے گی۔ ان تفکرات۔ تخیلات اور مشقیات کا ایک مکمل فن ہے اور اس کے سیکھنے سے آدمی بجائے غلام ہونے کے اپنا آقا ہو سکتا ہے۔ آدمی آدمی بن سکتا ہے ہمارے ہاں تھا مگر اب مُردہ ہے۔ امریکہ میں آج لاکھوں آدمی اُسے عمل میں لا

سہے ہیں اور ترقی کی کوئی منزل اُنہیں دشوار گذار نہیں معلوم ہوتی۔اس کی تائید میں ایک ذاتی واقعہ عرض کرتا ہوں۔امریکہ کے ایک لائق اہل دل ڈاکٹر کوپس ٹرنبل صاحب جو فلسفہ اور طبیعات میں ید طولیٰ رکھتے ہیں اور وہاں کے کئی اضلاع کے مقتدا مانے جاتے ہیں۔کئی سال ہوئے ہندوستان میں تشریف لائے تھے۔نینی تال آئے تو میں بھی اُن کی خدمت میں حاضر ہوا۔دس بیس ہندو مسلمان اور بھی موجود تھے۔یہ ذکر شروع ہوا کہ ہندوستان میں قومی محبت بہت کم ہے اُنہوں نے کہا کہ میں اُس کی اندرونی عملی تدبیر بتاؤں گا۔دوسرے دن شام کے وقت ہم سب کو ایک علٰحدہ جگہ لے گئے حلقہ کیا یعنی سامنے آپ بیٹھے اور گرد و پیش سب کو بٹھایا۔آنکھیں بند کرائیں اور کہا کہ قلب کی طرف متوجہ ہو کر یہ تصور کرو کہ ہم میں سے ایک درخت پیدا ہو کر کل عالم پر سایہ کرتا ہے کوئی دس منٹ ہم لوگوں نے ایسا کیا کبھی کبھی طبیعت بٹ بھی جاتی تھی۔ مگر ایک عجیب سرور معلوم ہوا اور اُن کے جانے کے بعد بھی فرداً فرداً ہم میں سے بعض نے ایسی نشستیں کیں اور قوائے اندرونی کے جلا سے اپنے میں بمقابلہ پہلے کے ہمت اور ہمدردی وغیرہ کے مادہ کو زیادہ پایا۔جو لوگ اپنے لئے قوم کے لئے۔ملک کے لئے۔مذہب کے لئے کچھ کرنا چاہتے ہیں وہ ضرور اس فن کی طرف توجہ کریں۔اوّل اوّل بندی کو غذا کا اعتدال بھی نہایت مفید ہوتا ہے۔ اِن غذاؤں صحبتوں اور مشاغل سے جو بے اعتدالیوں کی طرف لے جاتی ہیں۔ چندے بچنا چاہئے اعتدال خود انسان میں موجود ہے جہاں اِن معتدلات کو قابو میں کیا۔اور اندرونی جوہر چمکنے لگے۔پھر دیکھئے زندگی کا غبارہ کتنا اونچا جاتا ہے ؛

حُسنِ اتفاق اور خوبی تقدیر سے مذہباً ہمیں خدا ایسا مکمل اور ہر قوت کا خزانہ بتایا گیا ہے کہ اپنے تصوّرات۔تفکرات اور تخیلات میں ہم اپنی ہر ضرورت کے واسطے اور تمام قوائے اندرونی کو جلا دینے کے لئے خدا کی طرف رجوع کر سکتے ہیں اگر محبت کے مادہ کو جلا دینی ہے تو خدا سے زیادہ سرچشمہ محبت کا اور کون

ہوسکتا ہے۔ عدل کے خیال کو پکانے کے لئے اُس سے بہتر اور کون ملے گا۔ ہمت کی کلید سوائے اُس کے اور کس سے مل سکتی ہے۔ الغرض جس قدر زیادہ ہم اپنے بین خدا کا ایریھر رکھیں گے۔ اور خیالات الفاظ اور دعائیں مناسب ضرورت معین کر کے سرچشمۂ حیات یعنے ذات باری کی طرف توجہ کرینگے اسی قدر زیادہ ہماری زندگیاں سوسائٹی کے لئے مفید ثابت ہوں گی۔ یہ کام آسان بھی ہے۔ مشکل بھی ہے ؎

فاصلہ کوچۂ محبوب کا کیا پوچھتے ہو ۔۔۔ جیسا مشتاق ہو نزدیک بھی ہے دور بھی ہے

احسانِ اور محبّت

احسان اگر مناسب طریقے پر کیا جاوے تو زندگی میں ہر قسم کے بیرونی مفاد کا موجب ہو سکتا ہے۔ البتہ ہماری محبت اُن کے دلوں میں پیدا نہیں کر سکتا جن سے اس زندگی میں ہمیں واسطہ پڑتا ہے احسان ہماری قدر و منزلت کا باعث ہو سکتا ہے اور اکثر لوگوں کو ہمارے ساتھ ایسے سلوک پر آمادہ کر سکتا ہے جو سچّی محبت سے بہت کچھ مشابہ ہو۔ مگر حقیقی محبّت کا منبع دل ہے۔ جو خودرو ہوتی ہے۔ نہ کسی درجے کی سخاوت پیدا کر سکتی ہے۔ نہ قیمتی انعامات اس کو بڑھا سکتے ہیں۔ اور نہ کسی قسم کی فیاضی اس کو قائم رکھ سکتی ہے۔ خود وہ شخص جو ممنونِ احسان ہے۔ اس قدر قدرت نہیں رکھتا کہ وہ اپنے غیر مستقل جذبات کو کسی کی محبت پر مجبور کرے اور اپنے اختیار سے احسان مندی کی حس کو جذبۂ اُلفت میں تبدیل کرے۔

کسی قیمتی شے کا عطا کرنا جو مناسب فیاضی پر مبنی ہو محسن کے لئے لوگوں کی رضامندی اور خوشی حاصل کر سکتا ہے اور ممنونِ احسان پر اُن فرائض کی حس کا بوجھ ڈال سکتا ہے۔ جن کی ادائیگی اس پر واجب ہے اور یہی حس فی الحقیقت احسان مندی ہے۔ اور محض احسان مندی ہی جس میں محبّت کا کوئی جزو نہیں کُل وہ صلہ ہے جو ایک ممنون دل ان منافع کے عوض میں پیش کر سکتا ہے جو اُسے پُہنچے ہوں۔

مگر محبت اور احسان مندی دو مختلف جذبات ہیں۔ محبّت اکثر اوقات ایک خود مختار جوشِ طبیعت ہے جو بغیر ہماری خواہش کے دفعتاً وارد ہو جاتا ہے۔ اور اکثر بغیر اس کے کہ پہلے سے ہمارے دل میں کسی شخص کی قدر و منزلت ہو ہم خود

بخود دیکایک اس کے دلدادہ ہو جاتے ہیں۔ ہم بعض آدمیوں سے نہایت سچی محبت رکھتے ہیں مگر نہیں جانتے کہ کیوں؟ ہمارے دل میں ان کے تمام معاملات کے متعلق ایک جوش سا اُٹھتا ہے۔ ہم اُن کے تصوروں کو بالکل اسی طرح نظر انداز کرتے ہیں جیسے اپنی کمزوریوں کو اور ان کی خوبیوں کو اُسی نگاہ تحسین سے دیکھتے ہیں جیسے ہم اپنی نیکیوں کو۔ جب تک یہ جذبہ ہمارے دل میں موجود رہتا ہے ہم اس کے مزے لیتے ہیں۔ اور نہایت شوق سے اُس کا خط اُٹھاتے ہیں۔ اور اگر کبھی اس سے رکنا چاہتے ہیں تو نہایت آزردگی سے۔ اور محبت کا صلہ صرف محبت ہی ہے جس کی ہم توقع یا خواہش کرتے ہیں۔

برخلاف اس کے احسانمندی خود بخود کبھی کسی دل میں پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ ہمیشہ نتیجہ ہوتی ہے ہمارے سابقہ افعال کا جو ہمارے ارادے اور کوشش پر مبنی ہوتے ہیں۔ احسان کو ہم ایک قرض سمجھتے ہیں۔ اور جب تک ہم اس کے بوجھ سے سبکدوش نہ ہو جائیں ہمارے دل پر ایک بوجھ سا محسوس ہوتا رہتا ہے۔ احسان مندی کا اقرار ایک عاجزی کا اظہار ہوتا ہے اور بعض لوگ اس قوم کی عجز پسندی کے زیادہ عادی ہوتے ہیں۔ وہ تمام احسانات کو جن کے وہ ممنون ہیں بار بار دوھراتے ہیں صرف اس لئے کہ وہ خیال کرتے ہیں کہ ایسا کرنا احسان کے قرض میں سے کچھ نہ کچھ ادا کرنا ہے۔

پس محبت تو ایک نہایت خوش گوار اور پسندیدہ دلی جذبہ ہے۔ مگر احسان مندی نہایت مذلل ہے۔ جب کبھی ہم اپنے محبوب کا تصور کرتے ہیں تو یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم اپنی پسند پر نازاں اور خوش نہ ہوں۔ برخلاف اس کے وہ شخص جس نے ہمیں احسان کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے ہمارے تصور میں مثل اُس شخص کے آتا ہے جس نے ہماری آزادی چھین لی ہو۔ اس لئے محبت اور احسان مندی دونو جذبے کبھی ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔ بغیر اس کے کہ وہ ایک دوسرے کو درہم برہم نہ کریں۔ ان دونوں ہم صرف ایک دوسرے

کو اپنے تعلقات کے بموجب کسی شخص کے لئے مخصوص کر سکتے ہیں۔ دونوں کو ہرگز نہیں۔ بڑے بڑے احسانات کے قرض سے دل کا دوالہ نکل جاتا ہے اور جس قدر زیادہ احسانات ہم پر کئے جاتے ہیں۔ اُن کی آیندہ ادائیگی کی اُمیدیں کم ہوتی جاتی ہیں۔ اور یہ بات اُس راہ میں رُکاوٹ پیدا کرتی ہے جو خلوص اور محبّت کی طرف لے جاتی ہے۔

پس اپنے تعلقات کے درست رکھنے کے لئے صرف فراخ دلی ہی نہیں بلکہ تھوڑی سی عقل کی بھی ہمیں ضرورت ہے۔ اس لئے کہ ہم ان تمام احسانات کی قیمت کا۔ جو ہم لوگوں پر کرتے ہیں خیال بھی نہ کریں اور ان کو جہاں تک ہو سکے نہایت ہلکا اور ادنیٰ ظاہر کریں۔ محبّت ایسی ترکیبوں سے پیدا ہو سکتی ہے۔ نہ زبردستی۔ احسان کرتے وقت ہمیں اپنے آپ کو ایسا ظاہر کرنا چاہیئے۔ کہ گویا ہمیں خبر بھی نہیں کہ ہم کسی پر احسان کر رہے ہیں۔ اور اس طرح دوسرے کے دل کو پوری آزادی ہونی چاہیئے خواہ وہ ہماری محبّت قبول کرے یا نہ کرے کیونکہ اپنے احسانات کے اظہار سے محبّت کرنے کے لئے مجبور کرنا اگرچہ احسان مند کو احسانمند ہی رکھتا ہے لیکن دل میں ایک نفرت سی ضرور پیدا کرتا ہے۔

اگر صرف اظہارِ احسان مندی کا حصُول ہی ہمارا مقصود ہو تو اُس کے لئے کسی بڑی ہوشیاری کی ضرورت نہیں۔ نفع رسانی مقتضی ہے اس بات کی کہ ممنون اس نفع کا اقرار کرے۔ اور ہمیں حق حاصل ہے کہ اپنے واجب کی ادائیگی پر مُصر ہوں۔ لیکن یہ نہایت ہی دور اندیشی کی بات ہوگی کہ اگر ہم ایسے موقعہ پر اپنے حق سے دست بردار ہو کر اس کا تبادلہ اگر ممکن ہو تو محبت سے کر لیں۔ ہمیں تو احسان کے بار بار دوہرائے جانے سے خاک بھی فائدہ نہیں ہوتا مگر وہ لوگ جو اظہارِ احسانمندی کرتے ہیں اس سے بہتیرا کچھ نقصان اُٹھاتے ہیں۔ احسان مندی کے اظہار کا مطالبہ کرنا ایک ایسے قرض کو مانگنا ہے۔ جس سے قرضخواہ کو ذرّہ برابر بھی نفع نہیں مگر قرض دار اُس کو نہایت ناراضگی سے ادا کرتا ہے۔

حکیم مینوس حکمت کی تلاش میں پھرا کرتا تھا کہ رات نے ایک دفعہ اسے پہاڑ کے دامن میں آدبایا۔ بارش اور بادل کی کڑک نے تنہائی کو اور بھی ہیبتناک زیادہ بنا دیا تھا۔ کہ پھرتے پھرتے ایک فقیر کا جھونپڑا نظر پڑا جس کی طرف وہ مڑا اور پاس پہنچ کر فقیر سے اس میں رات بسر کرنے کی اجازت چاہی۔

فقیر نے ایک سخت لہجے میں کہا "اندر چلا آ آدمی تو ہرگز بھی مستحق نہیں ہیں کہ اُن پر کوئی احسان کیا جائے۔ مگر ان کے ساتھ ایسا سلوک کرنا جس کے وہ مستحق ہیں اُن کی احسان فراموشی کی مثال کی تقلید کرنا ہے۔ اندر چلا آ۔ بُرائیوں کی مثالیں بعض دفعہ ہمیں نیکیوں میں مستحکم بنا دیتی ہیں۔"

کچھ کھانے پینے کے بعد جو نباتات اور چائے پر مشتمل تھا۔ مینوس اپنے تعجب کے اظہار کو نہ روک سکا کہ فقیر نے دنیا کے لوگوں سے کیوں علیحدگی اختیار کی ہے حالانکہ اُن کے افعال تو حکمت کے نہایت سچے سبق سُناتے ہیں۔ فقیر برافروختہ ہو کر بولا "آدمی کا تو تو نام بھی نہ لے۔ میں اس کمینہ اور احسان فراموش دنیا سے علیحدہ ہی بھلا۔ یہاں جنگل میں مجھے ایسے ہمسایوں سے واسطہ ہے جو خوشامدی نہیں۔ شیر ایک فراخ دل دشمن ہے۔ اور کُتا ایک باوفا دوست لیکن آدمی! کمینہ آدمی! زہر کا پیالہ دیتا ہے اور جس وقت دیتا ہے اسوقت اسکے لبوں پر تبسم ہوتا ہے۔" حکیم نے دانائی سے کہا "شاید لوگوں نے تمہارے ساتھ بُرا سلوک کیا ہے"

فقیر نے کہا "ہاں! لوگوں پر میں نے اپنی ساری دولت لٹا دی اور صرف ایک یہ لکڑی۔ یہ پیالہ اور یہ نباتات ہے جو میرے پاس اس وقت رہ گئے ہیں۔"

مینوس نے کہا تو تم نے کیا اپنی دولت کو بخشش میں صرف کیا تھا یا صرف قرض دی تھی۔"

فقیر بولا بیشک! میں نے لوگوں کو اپنی دولت بخش دی۔ قرض دینا کون سی

خوبی ہے؟ حکیم نے پھر کہا۔" تو پھر جو کچھ تم نے اُنہیں دیا اُس کا انہوں نے اقرار اور اظہار بھی کیا؟"

فقیر نے چلاّ کر کہا۔" ہزاروں دفعہ۔ وہ تو ہر روز میرے احسانات کے عوض میں شکر گذاری کا اظہار کرتے تھے۔ اور آئندہ احسانات کے واسطے طرح طرح کی التجائیں۔" مینوس مُسکرا کر بولا۔" اگر تم نے اپنی دولت کو بطور قرض نہیں دیا۔ کہ وہ واپس کی جاتی۔ تو پھر یہ نا انصافی ہے کہ تم لوگوں پر احسان فراموشی کا الزام لگاتے ہو۔ اُنہوں نے تو اقرار کیا کہ وہ تمہارے ممنون احسان ہیں۔ اور یہی تم اُن سے اُمید رکھ سکتے تھے۔ اور اُنہوں نے بلاشبہ تمہارا احسان ہر ایک اکثر اپنے ہی اظہار و اقرار احسان مندی کے سبب حاصل کیا۔" فقیر جواب سے متعجب ہوا۔ اور اپنے مہمان کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔" میں نے مینوس کا نام سُنا ہے اور تو یقیناً وہی ہے۔ میں اگرچہ اسّی برس کا بوڑھا ہوں۔ مگر عقل کے لحاظ سے ابھی بچہ ہی ہوں۔ چل مجھے دُنیا کی تعلیم گاہ میں لے چل۔ اور اس طرح تعلیم دے جیسی کہ تو اپنے سب سے جاہل اور سب سے چھوٹے شاگرد کو دیتا ہے۔

میرے عزیز بلاشبہ اس زندگی کے سفر میں دوست مل جانا بسا غنیمت ہے۔ چہ جائیکہ چند مفت خور ہمارے احسان مند ہوں اور چونکہ محبّت زیادہ تر دل کے متعلق ہے۔ اس لئے یہ احسان کے شکریہ کی نسبت زیادہ دیرپا ہے جب ہم پر کوئی بڑا احسان کیا جاتا ہے۔ تو ہم ایک قسم کی بےچینی سی محسوس کرتے ہیں کہ جلد اس کا شکریہ ادا کریں۔ اور جب یہ شکریہ ایک دفعہ رد کیا جاتا ہے تو پھر کبھی دوبارہ حاصل نہیں ہو سکتا اور وہ دل جو اس قدر کمینہ ہے کہ احسان کے عوض شکریہ کے فوری صلہ کو بھی روا نہ رکھے وہ بجائے اس کے کہ احسان کے یاد کرنے پر کسی قسم کی بےچینی محسوس کرے۔ اپنی اس نئی حاصل شدہ آزادی پر نازاں ہوتا ہے! اور ایک حد تک اس ظاہرا کمینہ پن سے خوش۔

البتہ اُن دو دوستوں کی صورت بالکل جُداگانہ ہے۔ جن کے دل ملے ہوئے ہوں۔ عارضی جدائی بھی دونو کی بے تابی کا موجب ہوتی ہے اور اُس منقسم وجود کی طرح (جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ انسان بُرج جوزا کی صُورت میں پیدا کیا گیا تھا۔ اُس کے دونوں طرف منہ تھے۔ یعنی دو آدمیوں کو پشت کی طرف سے ملا کر کھڑا کر دیا جائے تو اس کہانی کے مطابق انسان کی اصلی صورت ہو جائے گی۔ پھر انسان بیچ میں سے تقسیم کر دیا گیا اور چونکہ دو آدمی ایک دوسرے کا جُزو ہیں اس سے ایک دوسرے کے ملنے کے نہایت مشتاق ہوتے ہیں) اُن کی ہمدرد روحیں ایک دوسرے سے وصل کی خواہش کرتی ہیں۔ دونوں کی خوشیاں نامکمل ہوتی ہیں۔ اُن کے سبب خرم اوقات میں بھی بے چینی سے خالی نہیں ہوتے وہ نہایت ہی انوکھے بہانے ڈھونڈھتے ہیں کہ اُس رکاوٹ کو جو اُن کے وصل میں حائل ہو دور کریں۔ نہایت ہی خفیف سا اقرار تقصیر اور ایک نہایت ہی ادنیٰ واقعہ دونوں کے وصل کا باعث ہو جاتا ہے۔

ایک دفعہ ایک نفیری باز اور اُس کی بیوی میں جو عام لوگوں کی طرح مشقت کی زندگی بسر کرتے تھے اور جن میں بھی کبھی شکر رنجیاں بھی ہو جاتی تھیں۔ کسی دن ایک بات پر شکر رنجی ہو گئی۔ اور اس کو دونوں نے جوش کے ساتھ قائم رکھا بیوی کو یقین تھا کہ وہ حق پر ہے اور خاوند نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ جو میں چاہوں وہ ہی ہو۔ جھگڑا طویل ہوتا گیا۔ اور دونوں کا غصہ اس درجے کو پہنچا۔ کہ دونو نے قسمیں کھالیں کہ آئندہ کبھی وہ رات کو اکٹھے نہیں سوئیں گے۔ یہ قسم تیزی مزاج کا نتیجہ تھی۔ کیونکہ وہ اب بھی دلوں میں ایک دوسرے کے دوست تھے۔ پھر اُن کے گھر میں مثل اور غریب آدمیوں کے کُل ایک ہی پلنگ تھا تاہم اُنہوں نے اس قسم کے پورا کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ رات کے وقت وہ اپنے درمیان میں ایک نفیری کا غلاف رکھ لیا کرتے تھے۔ تا کہ ایک دوسرے سے جُدا رہیں اسی طرح اُنھوں نے تین ہفتے گذارے۔

اس اثنا میں دونو دل ہی دل میں اپنی اس قسم کھانے کا افسوس کرتے تھے۔ اُن کا غصہ فرو ہو چکا تھا۔ اور اُن کی محبت عود کرنے لگی تھی۔ دونو چاہتے تھے کہ اس نیفری کے غلاف کو بیچ میں سے نکال پھینکیں لیکن کسی میں اتنی جرأت نہ تھی۔ ایک دن جب رات کو وہ دونو جاگ رہے تھے اور نیفری کا غلاف اُن کے درمیان میں تھا۔ اتفاق سے خاوند کو چھینک آئی۔ بیوی نے حسب معمول کہا "یرحمک اللہ"۔ خاوند نے کہا "اے بیوی کیا تو اپنے دل سے یہ کہتی ہے"۔ بیوی نے جواب دیا "ہاں میرے پیارے نکالس۔ بے شک میں تہ دل سے یہ کہتی ہوں"۔ میاں نے کہا "تو پھر اچھا ہم اس غلاف کو بیچ میں سے کیوں نہ نکال ڈالیں"؟

لطیف احمد

اُپنشد

ہندو فلسفہ اور تصوف کا مجموعہ

اُپنشدوں کی عبارت نہایت دقیق ہے۔ اور ان پر بے انتہا شرحیں سنسکرت زبان میں لکھی گئی ہیں۔ اور ان میں سے بعض کے ترجمے یورپ کی مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ اس میں شک نہیں۔ کہ یورپین دماغ کے لئے ان کی اصلی تہ کو پہنچنا نہایت دشوار ہے۔ اور اس وجہ سے یورپی ترجمے اکثر ناقص ہیں۔ لیکن ان ترجموں سے اس قدر فائدہ البتّہ ہوتا ہے۔ کہ یورپین عُلما کا طرزِ خیال اور مشرقی مسائل پر نظر ڈالنے اور نتائج نکالنے کا طریقہ معلوم ہو جاتا ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس وقت تک اُردو میں کوئی ترجمہ اپنشد کا شائع نہیں ہوا ہے۔ گو اس کی سخت ضرورت ہے۔ ہم اپنے ترجمے میں اوّلاً شنکر اچاریا کی شرح اور انند گیری کے حاشئے کو جو اس نے اس شرح پر لکھا ہے ملحوظ رکھیں گے اور اس کے سوا جو کچھ یورپ کے مصنفین نے اپنشدوں کی نسبت خیالات ظاہر کئے ہیں اور جو کچھ توجیہیں انہوں نے مختلف مقامات کی ہیں۔ ان سے بھی کام لیں گے۔

دس اُپنشدوں کے مجموعہ میں جو بمبئی اور کلکتے میں چھپا ہے۔ سب سے پہلا اُپنشد ایشوپنشد ہے اور اسی کے ترجمے سے ہم ابتدا کرتے ہیں۔ یہ اُپنشد شکل یجر وید سے متعلق ہے۔ اور شت پتھ برہمنہ[1] کے آخر میں واقع ہوا ہے اور نظم میں ہے۔ جدید تحقیقات سے یہ ثابت ہوا ہے کہ جن اُپنشدوں کی عبارت نثر

---

[1] شت پتھ کے لفظی معنے صد باب ہیں ۱۲

ہے وہ بمقابل نظم اپنشدوں کے زیادہ قدیم ہیں۔

ایشو پنشد ایک لحاظ سے خاص دلچسپی رکھتا ہے۔کیونکہ یہ ایسے وید سے متعلق ہے جس میں نرے اعمال بھرے ہوئے ہیں۔اور نجات کا دار و مدار انہی اعمال کے درست طور پر انجام دینے میں قرار دیا گیا ہے۔برخلاف اسکے اُپنشد اور ویدانت کی تعلیم یہ ہے۔کہ نجات کا دار و مدار محض ودیا یعنے اصلی علم پر ہے جس وقت انسان دُنیا کے ظاہری محسوسات سے پار ہو کر ان محسوسات کی جو جڑ ہے اُس تک پہنچ جاتا ہے۔تب اُس کو مُکتی ملتی ہے۔پس گویا اس اُپنشد کی تعلیم میں اور اُس خاص وید کی تعلیم میں جس کا یہ ضمیمہ ہے۔ایک قسم کا تباین واقع ہوا ہے

ایشو پنشد

۱۔تمام دنیا یعنے جو کچھ اس زمین پر ہے اور اُس کے ساتھ حرکت کرتا ہے صرف ایشیا (خدائے مطلق) کا ظہور ہے۔وہ اُن سب پر حاوی ہے اور سب کو ڈھانکے ہوئے ہے۔پس اس دُنیا کو چھوڑ کر اصل حقیقت کو پا اور سچا تمتع حاصل کر۔اے شخص! کسی کی دولت پر نظر نہ ڈال۔

۲۔اگر کوئی سو برس تک جینے کی تمنا رکھے۔تو اس کو چاہئیے کہ کریا کرم (اعمال) اور عبادت کرتا جائے۔یہی راستہ ہے۔کوئی دوسرا راستہ نہیں۔جس سے انسان کو بُرے کام نہ چمٹ جائیں۔

یہ اشارہ اُن لوگوں کی طرف ہے۔جو دنیا کو ترک کر کے اور صرف اتمن پر دھیان دے کر نجات حاصل کرنا نہیں چاہتے۔بلکہ دنیا میں رہنا چاہتے ہیں۔پس اِن کے لئے یہی راستہ بنایا گیا ہے۔کہ نیک کام کریں اور برسوں دنیا میں جیئیں۔اس قسم کے اعمال اُن کو بار بار جنم لینے اور سنسار کے چکر سے بچائیں گے۔

۳۔جو شخص اتمن کو مارتے ہیں۔یعنی اتمن کے علم پر جہالت کا پردہ ڈالتے

ہیں۔ وہ اِس جنم سے نکلنے کے بعد ایسے جنموں میں جا پہنچیں گے۔ جو اسر دل کے جنم ہیں۔ اور گہری تاریکی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

۴۔ وہ اتمن ایک ہے۔ لاثانی اور مستقیم بلا حرکت ہے اور اس کے ساتھ ہی انسان کے ذہن سے بھی زیادہ تیز ہے۔ انسان کے حواس اسکو پا نہیں سکتے وہ اُن سے آگے آگے جاتا ہے۔ باوجود ایک مقام پر مستقیم ہونے کے وہ اُن سے زیادہ تیز ہے جو اُس کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ اسی کی بدولت ہوائے لطیف تمام عالم کی روح اور تمام جانداروں کے افعال و حرکات کو قائم رکھے ہوئے ہے۔

اِس فقرے میں اتمن کی حالت بیان کی گئی ہے۔ اِس کے مستقیم ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس میں کسی قسم کا کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا اور اس کی تیزی سے یہ مراد ہے کہ جس قدر دور تک انسان اپنے خیال اور ذہن کو جولانی دے۔ اُس کا منتہا اتمن ہے۔ گویا اتمن اُس کے خیال سے بھی پہلے وہاں جا کر موجود ہو گیا۔

۵۔ وہ حرکت میں آتا ہے اور بے حرکت۔ وہ دور ہے۔ اور پھر نزدیک ہے وہ اس تمام عالم کے اندر ہے اور پھر تمام عالم سے باہر ہے۔

۶۔ جو کوئی تمام عالم کو اپنے ہی اتمن میں پاتا ہے۔ اور اپنے اتمن کو تمام عالم میں پاتا ہے۔ اُس کو کوئی امر نفرت انگیز نہیں معلوم ہوتا۔

چونکہ ایسا شخص اصل حقیقت کو پا گیا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اُسے کسی ایسی چیز کا سامنا نہیں ہوتا۔ جو نفرت دلائے۔

۷۔ جب کہ عارف کی نظروں میں تمام عالم خود اس کی اتمن میں سما جاتا ہے پھر اُسے کس امر کی پریشانی اور کس امر کا رنج۔ وہ تو وحدتِ وجود کو پا گیا ہے۔

۸۔ یہ اتمن نورانی ہے اور بے جسم۔ حس سے بری۔ خالص اور پاک بصیر اور علیم۔ جبار اور قوی۔ ہر چیز پر محیط ہے۔ اور ہر ایک کو اُس نے اپنا اپنا فرض

دوام کے لئے تقسیم کر دیا ہے۔

۹۔ جو اودیا (مراد کریا کرم) کو مانتے ہیں۔ وہ گہری تاریکی میں ہیں۔ لیکن وہ جو ودیا (مراد دیوتاؤں) کی پرستش کرتے ہیں وہ اس سے بھی زیادہ تاریکی میں ہیں (یہ شنکر اچاریا کی شرح کے مطابق ترجمہ ہے۔ لیکن اس کی نسبت آخر میں بحث کی گئی ہے)

۱۰۔ کہا جاتا ہے کہ ودیا کا پھل اور ہے اور اودیا کا پھل کچھ اور۔ یہ ہم برابر اُن منیوں سے سنتے آئے ہیں جنہوں نے ہمیں ودیا اور اودیا کی تعلیم کی۔

۱۱۔ جو ودیا اور اودیا دونوں کو جانتا ہے وہ اودیا کے ذریعے سے موت سے بچتا ہے اور ودیا کے ذریعے سے حیاتِ جاودانی پاتا ہے۔

۱۲۔ جو لوگ اُس چیز کی پرستش کرتے ہیں۔ جو سبب اوّل نہیں ہے۔ گہری تاریکی میں پڑ جاتے ہیں اور جو بلاواسطہ سبب اوّل کے پیچھے جاتے ہیں وہ اس سے بھی زیادہ تاریکی میں پڑتے ہیں۔

۱۳۔ کہتے ہیں کہ سبب اوّل کے علم سے ایک بات حاصل ہوتی ہے۔ اور اس چیز کے علم سے جو صرف درمیانی سبب ہے کچھ اور ہی حاصل ہوتا ہے یہی ہم منیوں سے سنتے آئے ہیں جنہوں نے تعلیم دی ہے۔

۱۴۔ جو کوئی سبب اوّل کو جانتا ہے اور اس کے ساتھ ہی فنا سے بھی واقف ہے وہ فنا کے ذریعے سے موت پر فتحیاب ہوتا ہے اور سبب اوّل کو جاننے کی وجہ سے حیات جاودانی پاتا ہے۔

۱۵۔ حقیقت کا چہرہ سونے کے ڈھکنے سے چھپا ہوا ہے۔ اوآفتاب! کھول دے تو ڈھکنا۔ تاکہ مجھ سا جو یائے حقیقت اُس چہرے کو دیکھ لے۔

۱۶۔ او آفتاب! تنہا آکاش میں پھرنے والا۔ سب کا سنبھالنے والا۔ اد سوریا پرجاپتی کا فرزند۔ اپنی کرنوں کو الگ کر اور سمیٹ لے۔ میں تیرے نور کو تیری شاندار صورت کو دیکھتا ہوں۔ میں ہوں پرش جو تیرے اندر ہوں۔

۱۷- اَے میری رُوح تو جا کر ہولے جاودانی میں مل جا اور اَے جسم تو جل کر خاک ہو جا۔

اوم[1]۔ او نفس آمارہ یاد رکھ یاد رکھ میرے اعمال کو۔ او نفس یاد رکھ یاد رکھ میرے اعمال کو۔

یہ الفاظ گویا ایسے شخص کی زبان سے ہیں جو نزع کی حالت میں ہے۔

۱۸- او اگنی[2] ہمیں نیک راستے سے اپنے اعمال کے پھلوں سے متمتع کر۔ کیونکہ تو ہمارے کل اعمال جانتا ہے۔ گناہ اور بدی کی کجی کو ہم سے دور کرتا ہے تجھے بار بار سجدہ کرتے ہیں۔

تمام اپنشدوں میں یہ اپنشد نہایت مشکل ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اپنشد اور ویدانت کی اصلی تعلیم میں نجات کا دارومدار صرف اتمن یعنی وحدت وجود کے علم حاصل کرنے پر رکھا گیا ہے۔ حالانکہ اس اپنشد میں اعمال اور کرما کرم بھی ایک درجہ تک نجات کا ذریعہ مانے گئے ہیں۔ اسی لئے شنکراچاریہ کو اس کی شرح کرنے میں بعض جگہ دقت پیش آئی ہے۔ لیکن اس کی دو شرحیں اور بھی ہیں ایک تو مہیدھر کی اور دوسری اووٹ کی اور ان شرحوں میں مشکل مقامات کو زیادہ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ لب لباب اس کی تعلیم کا یہ ہے۔ کہ اگر انسان اعمال نیک کرے۔ لیکن اس نیت سے نہیں۔ کہ اُن کا پھل پائے گا۔ بلکہ محض اس نیت سے کہ ایسے اعمال کے ذریعے سے اس کو وحدت وجود تک پہنچنے میں مدد ملے گی۔ تب اس قسم کے اعمال اس کے کام آئیں گے۔ اور ایسے کام کرتا ہوا وہ سو برس بھی جئے تو اس کے یہ اعمال مثل معمولی اعمال کے اس کو چمٹ نہیں جائیں گے۔ اور اُسے زندگانی کے چکر یعنے

---

[1] اوم۔ ایک نہایت مقدس لفظ ہے جو ہر ایک مقدس کتاب کو شروع کرتے وقت ایک خاص لحن سے ادا کیا جاتا ہے۔

[2] اگنی کے اصلی معنی آگ ہیں اور وید میں ایک بہت بڑا دیوتا اور ہر قسم کی قربانی کی مقبولیت کا ذریعہ سمجھا

سنسار میں نہیں رکھینگے۔ بلکہ وحدت وجود تک پہنچنے کے لئے اس قسم کے اعمال کی وساطت کی ضرورت ہے۔ کیونکہ وحدت وجود کا درجہ حاصل کرنے کیلئے نیچے کے طبقات سے گذرنا لازمی ہے اور بلا وساطت اِن طبقات کے وہ درجہ حاصل نہیں ہو سکتا اِسی وجہ سے برہمن کی عمر کا پہلا حصہ تحصیل علم میں صرف ہونا چاہئے۔ اور دوسرا کاروبار زندگانی اور کریا کرم کے کرنے میں اور تیسرا درجہ سنّیاس ہے۔ جس میں وہ تمام قیود سے چھوٹ جاتا۔ اور اُسے وحدت وجود کا علم ہو جاتا ہے۔ جو شخص ان درمیانی مدارج کو چھوڑ کر ایک مرتبہ سنیاسی تک پہنچنا چاہے وہ گنہگار خیال کیا جاتا ہے۔ اور اسی وجہ سے نویں فقرے میں اور بارہویں فقرے میں کہا گیا ہے۔ کہ جو لوگ اصل کی طرف جانا چاہیں یعنے بلا وساطت ایسے اعمال کے جن کا ذکر اوپر کیا گیا۔ وہ ان سے بھی زیادہ تاریکی میں ہیں جو صرف اعمال پر بھروسہ رکھتے ہیں اگرچہ شنکرا چاریا نے مشکل سے بچنے کے لئے نویں فقرے میں (اودیا) سے مراد وہ اعمال لئے ہیں جو پھل کی غرض سے کئے جائیں اور (ودیا) سے مراد صرف دیوتاؤں کا علم لیا ہے لیکن شاستر کے رو سے اس قسم کی (اودیا) پتری یوگ یعنے عالمِ ارواح میں پہنچاتی ہے اور اس قسم کی (ودیا) دیو یوک یعنی اندر وغیرہ دیوتاؤں کے عالم میں پہنچاتی ہے اور وہاں پہنچنے کے بعد بھی ممکن ہے کہ بندہ وحدت وجود اور نجات کا درجہ نہ حاصل کرکے پھر سنسار کے چکر میں پڑ جائے۔ غرض عارف کو یا لازم ہے کہ سیڑھی کے سب زینے طے کرتا ہوا وحدت وجود اور نجات مطلق کے درجے تک پہنچے۔

اگرچہ ویدانت سوتر میں مانا گیا ہے کہ بلا نیک اور بے غرض اعمال کی سیڑھی طے کئے ہوئے بھی مکتی حاصل ہو سکتی ہے لیکن ایسے اعمال کے ذریعے کو مستحسن ہی بتایا گیا ہے۔ بُدھ مذہب نے البتہ عمل کی قید بالکل اُٹھا دی۔ لیکن اِس اُپنشد کی تعلیم یہی ہے کہ عارف نیک اور بے غرض اعمال کے ذریعے

آپ کو تیار کرے، اور بتدریج اپنے تئیں وحدتِ وجود کے درجے تک پہنچائے لیکن صرف اعمال باعث نجات نہیں ہو سکتے۔ اگر یہ نکتہ ملحوظ رہے تو اس اپنشد میں کوئی امر باقی نہیں رہتا۔

سید علی بلگرامی (از کیمبرج)

مطالعۂ الفاظ

ذیل میں ہم ایک تمہیدی مضمون مطالعۂ الفاظ پر درج کرتے ہیں۔ اس کے لکھنے والے ہمارے مکرم دوست مولوی احمد دین صاحب۔ بی۔ اے۔ وکیل مصنف "اورنگ زیب" ہیں۔ مولوی احمد دین صاحب اپنے زمانۂ تعلیم میں نامور طلباء میں رہے ہیں۔ اور فراغت تحصیل کے بعد لاہور کے نامی وکلاء میں ہیں اس سلسلۂ مضامین کی تکمیل پر یقیناً سب ناظرین کی رائے ہوگی۔ کہ یہ اُردو میں ایک مفید اور نئی چیز ہے (ایڈیٹر)

علم و دانش کے بے بہا خزانے جو انسان کے دل و دماغ نے بہم پہنچائے ہیں ہم اچھی کتابوں میں کثرت سے بحفاظت تامہ جمع پائیں گے۔ اور یہ دولت بالعموم اِسی سبیل سے بنی آدم میں نسلاً بعد نسلاً متداول ہوتی نظر آتی ہے گی۔ لیکن اِس وقت کتابوں یا مسلسل تقریروں سے ہمیں بحث کرنا مقصود نہیں بلکہ ہمیں یہ جتانا منظور ہے کہ صرف الفاظ میں ہی بلالحاظ کسی فقرہ بندی یا عبارت کے اخلاقی اور تاریخی حقائق۔ اور انسانی جذبات اور ولولوں کے بیشمار گنجینے بھرے پڑے ہیں۔ اور ان سے بیش قیمت نصیحتیں حاصل ہوسکتی ہیں۔ بشرطیکہ ہم اُن کی طرف تھوڑی سی توجہ کریں۔ اس مضمون میں ہم اس بات کے ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ الفاظ جو ہم دن رات استعمال کرتے ہیں۔ پڑھتے یا سُنتے ہیں۔ خواہ وہ عالم روحانی کے متعلق ہوں۔ خواہ عالم جسمانی کے۔ یا معمولی الفاظ ہوں جو برزن و بازار میں رائج ہیں اور روزمرہ کی بول چال میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایسے ایسے قیمتی ہیروں کی کانیں ہیں جو دم بھر کے تجسس سے ہی ہمیں مالا مال کردیں۔ الفاظ پر غور کرنا یا یوں کہو کہ مطالعۂ

الفاظ رکیونکہ اکثر اوقات الفاظ بجائے خود ایک کتاب کا مضمون ئیے ہوتے ہیں فی الحقیقت ہمیں بدرجۂ اعلیٰ فائدہ پہنچائے گا۔

اکثر اوقات بیان کیا جاتا ہے کہ کسی چیز کی ناواقفیت ہماری نظروں میں اس کی قدر ومنزلت کو بڑھا دیتی ہے۔ اس سے زیادہ غلط بات انسان کے مُنہ سے کم نکلی ہوگی۔ کیونکہ اس کے معنے یہ ہوں گے کہ کسی چیز کی قدر ومنزلت کرنے کا خاصہ جو انسان میں ہے اس کی جڑ صرف فریب دھوکا ہے اور کسی چیز کی ماہیت سے واقفیت حاصل کرنا اس کی قدر ومنزلت کا خاتمہ ہے۔ مانا کہ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ہم اپنی واقفیت کے سبب کسی چیز کو سراہنے لگتے ہیں اور بعد میں زیادہ واقفیت پر وہ شئے معمولی سی نظر آتی ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ ہزارہا دفعہ ناواقفیت کی بدولت قابل قدر چیزوں کی ہم قدر نہیں کرتے۔ "علم شئے بہ از جہل شئے" ایک مشہور قول ہے۔ اور اس کی صداقت میں کسی ایک موقعہ پر بھی کسی وقت میں فرق نہیں آیا او نہ آسکتا ہے۔ خواہ ہم عجائبات قدرت کو دیکھیں اور خواہ عجائباتِ صنعتِ انسان پر نگاہ ڈالیں۔ علم زبان میں بھی اس کی صداقت کسی صورت سے کم نہیں۔ بسا اوقات یہاں ہم ذہنی اور اخلاقی عجائبات کے درمیان بے توجہی کی نظر اور لاپرواہی کے خیال سے اِدھر اُدھر چلتے پھرتے ہیں۔ جیسے کوئی مسافر مشہور میدان کارزار یا قدیم نامی شہروں میں سے بغیر طبیعت میں کچھ جوش پیدا ہونے کے گذر رہا ہو۔ اس لئے کہ اس کو ان بڑے بڑے کارناموں کی کچھ خبر نہیں۔ جو وہاں کے آسمان نے دیکھے ہیں اور وہ ان دلوں سے ناواقف محض ہے۔ جو اپنے اپنے ولولے خوش اسلوبی سے نکال کر زمین میں مل کر خاک ہو گئے ہیں۔ ہم بھی اُسی مسافر کی طرح واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے ایک اعلیٰ درجہ کے مفید جذبۂ دل کے پیدا ہونے کی خوشی سے محروم رہتے ہیں۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ان طرح طرح کی نصیحتوں سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتے

جو ہر وقت ہماری راہ میں (اگر ہم صرف اپنے ہاتھ پھیلانا اور انہیں اپنے تصرف میں لانا جانتے ہوں) بکھری پڑی ہوتی ہیں۔ یہ دولت سب سے زیادہ ہمارے روزمرّہ کے الفاظ میں ملتی ہے۔ تھوڑی سی واقفیت حاصل ہونے پر ہی ہم یکلخت پکار اُٹھیں گے کہ معمولی الفاظ میں بھی جو غریب سے غریب اور جاہل سے جاہل لوگوں کی زبان سے نکلتے ہیں۔ کیسے کیسے جواہرات لپٹے ہوئے ہیں۔ اور کیسے ہی خوب صورت پھول ہمارے قدموں میں پڑے ہوئے ہیں۔ جن کی اصلی لطافت اور پنکھڑیوں کی نزاکت ہر وقت پاؤں میں روندے جانے سے ناپید ہو رہی ہے۔

الفاظ کے استعمال۔ ان کی اصل۔ اور ان کی باہمی تمیز پر غور کرنے سے زیادہ مفید اور دلچسپ کسی اور چیز کا مطالعہ نہیں۔ اور آج ہم اسی مضمون کی بحث کی ابتدا کرتے ہیں۔ بعض لوگوں کا شاید خیال ہو کہ اصل الفاظ نکالنے انکے استعمالات کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالنے اور انہیں ایک دوسرے سے تمیز کرنے میں از حد محنت اور تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے۔ لیکن انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ محنت و تکلیف کی کلفت اگر کچھ ہو بھی تو لطف و مسرت سے جو اس کام میں حاصل ہوتے ہیں بدل جاتی ہے۔ اور شوق جو قدم قدم پر بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ہمارے لطف کو دوبالا کر دیتا ہے۔

کوئی زبان بھی ایسی نہیں جو ان خوبیوں سے مُعرّا ہو اور جس کے ہر ایک فقرے میں بیش بہا الفاظ کے موتیوں کی لڑیاں نہ پروئی ہوئی ہوں ہندستان کی مروّجہ زبان اُردو کو ہی لیجئے۔ گو اسے بہت پُرانی زبان ہونے کا دعویٰ نہیں مگر تھوڑی سی عُمر میں اس نے وہ قبولیت حاصل کی ہے کہ باید و شاید اور دوسری زبانوں کے الفاظ اور محاورات کو ایک خاص حد تک جذب کرنے میں وہ مناسبت دکھائی ہے جو بہت کم زبانوں میں پائی جاتی ہے۔ انگریزی کی طرح بہت سی السنہ سے مرکب ہے۔ مگر اس میں ایران کی میٹھی اور پیاری زبان

کا حصہ بہت زیادہ ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ اُردو کی بنا تو ہندوستان کی ایک قدیم اور سیدھی سادی بولی پر ہے۔ اور اب بھی جو کوئی اُس بولی کو تقریر و تحریر میں خوبی کے ساتھ نباہ سکے ہنرور گنا جاتا ہے مگر فارسی کی آمیزش نے اِس زبان میں وہ آبداریاں پیدا کی ہیں۔ جن کے بغیر اِس تیغ ہندی کے سارے جوہر کبھی نہ کھلتے۔ اس لئے ہم اس مطالعہ میں پہلے فارسی الاصل الفاظ کو لینگے کیونکہ ایسے الفاظ جو دوسری زبانوں سے آکر زبان میں رل مل گئے ہوں۔ بسا اوقات دلچسپ تواریخ رکھتے ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ہمیں ان کی اصلیت اور ابتدائی معنوں کے دریافت کرنے کی تکلیف گوارا کرنی ہو گی۔ مگر اسی تحقیقات میں کئی الفاظ ایسے بھی ملیں گے جن کی تاریخ سے ایسی قابل قدر واقفیت ہمیں حاصل ہو گی جو ایک جنگ کی تاریخ سے بھی نہیں ہو سکتی۔

نئی دُنیا کے ایک مشہور مصنف نے زبان کو نظم متحجر کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اور اُس نام سے اِس کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح حیوانات و نباتات متحجر میں خوش وضع حیوانات یا نازک پودے جو شاید ہزار سال گذرے ہیں کہ زندہ اور ترو تازہ تھے۔ ہمیشہ کے لئے عالم جمادات سے تعلق پیدا کر کے ہلاکت و فنا سے بچ رہے ہیں۔ اِسی طرح الفاظ میں بھی نازک خیالات اور دلفریب صورتیں۔ سلف کے جذبات و تصوّرات۔ گذشتگان کی اُمیدیں اور حسرتیں (گذشتگان جن کو قبروں میں سوتے ہوئے صدیاں گذر گئیں اور جن کا نام تک فراموشی نے ملیامیٹ کر دیا ہے) زندہ اور قائم ہیں اور معدومیت کی دستبرد سے ابدالآباد کے لئے ایمن ہو گئے ہیں۔ یہ نام مناسب اور دلکش ہے۔ اور اگر اس میں کوئی نقص ہو سکتا ہے۔ تو نقص تفریط ہے۔ زبان نظم متحجر ہو سکتی ہے اور فی الحقیقت ہے۔ لیکن اِنہی معنوں میں اور اسی زور سے ہم اس کی نسبت یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ زبان اخلاق متحجر یا تاریخ متحجر ہے تاریخی واقعات اور اخلاقی خیالات بھی اِسی کثرت اور اسی سہولیت سے صورت و جسم

لفظی قبول کر لیتے ہیں جو جذبات وخیالات انسانی کو حاصل ہے۔ بلکہ یہاں تک بھی ہوتا ہے کہ اگر کسی موقعہ پر انسان کی اخلاقی طبیعت میں کوئی سقم واقع ہو جائے تو الفاظ ہمیشہ کے لئے اس سقم کی زندہ شہادت قائم کر دیتے ہیں۔ ان سب امور پر ہم بالتفصیل بحث کریں گے لیکن فی الحال ہم ایک دو مثالیں بیان کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ ہمارا مطلب واضح ہو جائے۔

زبان جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے نظم متحجّر ہے۔ یا یوں کہو کہ اگر ہمیں کسی قوم کی نظم سے پوری واقفیت حاصل کرنی منظور ہو تو ہمیں صرف اُس کے اشعار یا نظم کی رنگینی میں رنگی ہوئی روایات کو ہی نہیں دیکھنا چاہیئے بلکہ ہمیں کئی ایک الفاظ بھی ملیں گے جو فرداً فرداً نازک خیالی کے پرورش یافتہ اور دلفریب نقش ونگار سے آراستہ ہیں۔ بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ان میں نظم کا عطر کھینچ کر بھر دیا گیا ہے۔ کسی لفظ کو لو اور اُسے ذرا نظر غور سے دیکھو تو فوراً معلوم ہو جائے گا۔ کہ لفظ مذکور میں عالمِ ذہنی اور عالمِ اجسام کی کسی بڑی مشابہت و مناسبت باہمی کا نقشہ کھچا ہوا ہے۔ عالمِ آخر الذکر کی رنگ آمیزی کی مدد سے اوّل الذکر کی تصویریں صاف و روشن اور قیام و دوام کی صورت میں نظر آتی ہیں۔ ممکن ہے کہ اب تصویریں بے حثییت اور معمولی سی دکھائی دینے لگی ہوں۔ اور شاید انہی الفاظ کی بدولت جو ہر ایک آدمی کے اثاثہ میں داخل ہو گئے ہیں۔ ایسی معلوم ہو رہی ہوں لیکن جس شخص نے پہلے اس مشابہت کو تاڑا اور اُس کے اظہار کے لئے ایک نیا لفظ ایجاد کیا تھا۔ یا کسی پرانے لفظ کو جو پہلے اپنے لغوی معنوں میں ہی استعمال ہوتا تھا اصطلاحی اور استعاری معنے دیئے وہ بزرگ ہر طرح سخن آفرین کے لقب کا مستحق ہے اور اس کی نازک خیالی و سخنوری بے شک اس قابل ہے کہ اسے سحر بیانوں کے زمرہ میں شمار کیا جاوے۔

مثلاً جس بندۂ خدا نے کسی کے برباد ہو جانے کا خیال اوّل ہی اوّل ظاہر

کیا تھا۔ ضرور ہے کہ اُس نے کئی دفعہ آندھی اور ہوا کو خس و خاشاک اُڑاتے دیکھا ہوگا اُس نے یہ بھی دیکھا ہوگا۔ کہ یہ خس و خاشاک تنکا تنکا ایک دوسرے سے جُدا کوئی کہیں اور کوئی کہیں اپنے اصلی مقام سے کوسوں دُور طوفان باد کے جھونکوں سے اُڑتے پھرتے ہیں۔ اور پھر اُن کی جمعیت کا حاصل ہونا ناممکن ہوجاتا ہے۔ اُن کو قرار مشکل۔ اور اُن کا نام و نشان مفقود ہوجاتا ہے۔ خس و خاشاک کی اس بیچارگی اور آوارگی کو اُس نے ایک مصیبت زدہ انسان کی حالت سے مقابلہ کیا۔ اور کچھ فرق نہ پایا۔ اسکی نازک خیال طبیعت نے فوراً اُس نامراد و کمبخت انسان کی حالت بیچارگی کو بھی بربادی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

بخت کے متعلق بھی بیدار و خوابیدہ کے الفاظ پہلے استعمال کرنے والے کے ذہن نے جاگتے اور سوتے انسان و حیوانات کی حالتوں پر غور کر کے یہ الفاظ بخت پر چسپاں کئے ہیں۔ جاگتے کی ہشیاری۔ جلب منفعت و دفع مُضرت میں چابکدستی۔ اپنی حفاظت۔ اپنی زندگی کے سامان مہیا کرنے کی فکر اور طاقت۔ سوتے کی بیکسی۔ کس مُپرسی۔ بیچارگی۔ اور ہُو بہُو موت کی سی صورت۔ ایک شاعرانہ مذاق کے لئے کافی و وافی مثالیں خوش طالعی اور شومئی بخت کی ہیں۔

احمد دین

دوست کا خط

تو پیارے دوست کا پیارا خط ہے! تجھ میں وہ کونسی برقی شئے بھری ہے جو میرے دل کو دھڑکاتی ہے۔ تجھے کھولتے وقت ہاتھ کیوں کانپنے لگتے ہیں۔ آخر تجھ میں اور کاغذوں سے کیا برتری ہے؟ تو بھی کاغذ کا ٹکڑا وہ بھی کاغذ کے ٹکڑے، بلکہ وہ تجھ سے زیادہ بڑے ہیں۔ ہاں، باعثِ تفاخر و تفوق یہی ہے۔ کہ دوست نے تجھے لکھا، لب پان خوردہ سے، اُف، لب پان خوردہ سے لفافہ بند کیا؟ بیشک بیشک یہ بہت بڑا تفوق ہے۔ اچھا، میں تیرا امتحان لیتا ہوں، تجھے نمبر دیتا ہوں سَو میں دیکھوں تجھے کتنے نمبر ملتے ہیں۔

ان کے ہاتھوں سے چھوئے جانے کے ۴۰

اس بات کے کہ دستہ کاغذ میں سے تجھے ہی منتخب کیا ۵۰

اُن لبوں نے لفافہ کو بند کیا $\frac{۵۰}{۱۴۰}$

ہیں! تو نے سَو سے زیادہ نمبر پائے۔ نہیں یہ امتحان ٹھیک نہیں ہوا، دوسرے طریقہ سے شمار ہونا چاہیئے۔

اس بات کے کہ تجھے میرے لئے منتخب کیا اور کسی دوسرے کے لئے نہیں منتخب کیا ۶۰

اس بات کے کہ اُن کے قلم کی تحریر تجھ پر ہے۔ ۴۰

اس بات کے کہ اُن کے چہرے کا عکس تجھ پہ پڑا، کیونکہ وہ فرماتے ہیں کہ یہ خط رات کو لکھا ہے۔ $\frac{۵۰۰}{۶۰۰}$

کیا؟ پھر سَو سے زیادہ ہو گئے، یہ ٹھیک نہیں۔ اچھا تیسری بار پھر امتحان

اس بات کے کہ تو انکے مژدۂ صحت و خوشنودیٔ مزاج کی خبر لایا ۸۰

اس بات کے کہ تجھے چاک کردینے کا حکم ہے ۱۰۰۰۰

یہ کیا؟ نمبر تو سو سے بھی بڑھ گئے۔

نہیں نہیں! میں بیفائدہ کوشش نہیں کرنے کا۔ تو امتحان سے بالا، موازنہ سے اعلیٰ قیدِ مقابلہ و مقائسہ سے آزاد، پیارے دوست کا پیارا، پیارا ہائے میں کیسے ظاہر کروں کتنا پیارا خط ہے۔ تو سینہ سے لگایا جائے گا، تو نظراً غباً سے بچایا جائے گا، (مگر حاشا) تو چاک نہیں کیا جائے گا۔ تو میرے پاس محفوظ رہے گا اور میں ہزاروں مرتبہ تجھے تنہا گوشوں میں پڑھوں گا۔

سجاد حیدر

زبانِ اُردو

اُردو کی زبان ابتدا شہنشاہ اکبر (۱۶۰۵-۱۵۵۶) کے عہد سے ہوئی ہے ہمایوں کے عہد میں سلطنت مغلیہ مضافات دہلی و آگرہ تک ہی محدود تھی۔ مگر اکبر کی ذکاوت اور اس کی قوتِ انتظام نے اس چھوٹے سے علاقہ کو ایک عظیم الشان سلطنت بنا دیا جو کابل اور قندہار کی سرحد سے شروع ہو کر اوڑیسہ اور حدودِ آسام تک پہنچتی تھی۔ اس کا دار الخلافہ کبھی شہر دہلی ہوا کرتا تھا اور کبھی آگرہ اور اُن شہروں کے درمیانی اضلاع کی زبان مغربی ہندی کی ایک شاخ تھی جس کو برج بھاشا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ غالب خیال یہ ہے کہ اکبر کے عہد تک مسلمان بھی ہندوؤں کے ساتھ میل جول رکھنے میں یہی برج بھاشا بولا کرتے تھے۔ مگر شہنشاہ مذکور کے زمانے سے اس تغیر کا آغاز ہوتا ہے جس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوا کہ ضرورت نے ایک نئی زبان پیدا کر دی اکبر کے کئی وزرا بالخصوص وزیر صیغۂ مال ہندو تھے۔ جن کو تقاضائے وقت کی وجہ سے اس وقت کی درباری زبان یعنی فارسی سیکھنی پڑی جس طرح انگلستان میں شاہانِ نارمن کے عہد سے اینگلو سکسن اور نارمن فرینچ کی آمیزش سے انگریزی زبان کا آغاز ہوتا ہے اسی طرح ہندوستان میں فاتحوں اور مفتوحوں کی زبانوں کی آمیزش سے یا یوں کہو کہ فارسی اور برج بھاشا کے ازدواج سے اُردو زبان پیدا ہوتی ہے۔ فارسی بولنے والے مسلمان سپاہی روزمرہ کے کاروبار میں جن کو دہلی اور آگرہ کے باشندوں کے ساتھ برتاؤ کرنا پڑتا تھا۔ اس آمیزش کے اور بھی ممد ہوئے یہاں تک کہ ہندی مصری۔ قشون شاہی یعنی اردوئے معلیٰ کے نام پر اُردو کہلانے لگی۔

حکومت مغلیہ کی توسیع کے ساتھ ساتھ شمالی اور کسی حد تک جنوبی ہندوستان میں بھی تعلیم یافتہ لوگوں میں اس زبان کی ترویج ہوتی گئی اور ہندوستانی مسلمان مصنفین کی فارسی تواریخ واشعار کے ساتھ اس نئی زبان کا علم ادب بھی ترقی کرتا گیا۔ دو صدیوں تک تو یہ علم ادب صرف مذہبی اور عاشقانہ نظموں تک ہی محدود تھا۔ جن کے مطالعہ سے زبان کی تدریجی نشوونما کا سراغ ملتا ہے لیکن سولھویں صدی کے اختتام سے پیشتر مسلمان شعرا کی طبع آزمائیاں شروع ہوتی ہیں۔ اگرچہ ان کا عروض اور ان کی زبان زیادہ تر ہندی اصل کی ہیں ۱۶۰۰ء کے قریب اردو شعرا فارسی بحور کا استعمال شروع کرتے ہیں اور رفتہ رفتہ فارسی الفاظ و محاورات اُردو زبان میں کثرت سے داخل ہوتے جاتے ہیں۔ اٹھارہوں صدی کے اختتام کے قریب (۱۷۹۰ء) اُردو نثر کا پہلا نمونہ شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ قرآن شریف شائع ہوتا ہے۔ مگر چونکہ اس کے مصنف نے عربی محاورات والفاظ و استعارات کی اندھا دھند تقلید کی ہے۔ اس واسطے یہ ترجمہ تصانیف ادبیہ میں شمار کیے جانے کا مستحق نہیں ہے۔

آخر اُنیسویں صدی کے شروع میں اُردو مصنفین نے یہ محسوس کیا کہ نثر اظہار خیالات و تاثرات قلبی کا ایک موزوں آلہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو نثر کی نشوونما میں ایک بیجا تعویق لاحق ہوئی ہے۔ تاہم یہ تعویق اپنے فوائد سے خالی نہیں رہی۔ مسٹر بیمز فرماتے ہیں۔

"بدقسمتی سے قریباً ہر ہندوستانی زبان کا یہی حال رہا ہے۔ کہ جب مصنفین نے اس زبان میں لکھنا شروع کیا تو اُن کی طرز تحریر سے قدرتی رنگ معدوم ہوگیا اور تصنع اور بناوٹ نے یہاں تک زور پکڑا کہ متاخرین نے متقدمین کی طرز تحریر کو بغیر کسی تبدیلی کے اختیار کر لیا" لیکن اُردو زبان اس قید سے مستثنے تھی اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض فارسی تصنفات کی تقلید سے اسے نقصان پہنچا تاہم یہ صحیح ہے کہ اُردو نثر نویسوں نے بالعموم ایسی طرز تحریر کو اختیار

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY HYDERABAD

کیاجو وقت کے تقاضے سے خودبخود پیدا ہوئی [illegible] کی
وجہ سے عوام کے فہم اور سمجھ کے عین مطابق [illegible]

موجودہ صدی میں اُردو نثر کی ترقی کے [illegible] ہیں
اوّل چھاپہ خانہ کی ترویج جو مسیحی واعظوں بالخصوص سیرام پور کے واعظوں کی وساطت سے ہوئی۔ دوم زبان انگریزی تعلیم جو ۱۸۳۲ء سے مسیحی واعظوں اور بالخصوص ڈف صاحب کے مساعی جمیلہ سے شروع ہوئی اور جس نے ہندوستان کی زبانوں پر مغربی علمی خزائن کے دروازے کھول کر اُن پر وہ احسان کیا جو گم شدہ یونانی علم ادب کی دریافت نے یورپ کی زبانوں پر کیا تھا۔ مغربی علوم و فنون کی ہوا نے اُردو زبان میں ایک نئی روح پھونک دی ہے اور شاید ہندوستان کی کوئی اور زبان اس مغربی اثر سے اس قدر متاثر نہیں ہوئی۔ جس قدر کہ یہ زبان ہوئی ہے۔ سوم اُردو زبان کا فارسی کے بجائے درباری زبان قرار دیا جانا اس واقعہ کے اثر نے پٹنہ اور پشاور کے درمیانی ممالک کو اُردو کے زیر نگین کردیا ہے۔ اور چونکہ دہلی اور آگرہ کو اب دارالخلافہ ہونے کا شرف نہیں رہا اس واسطے زبان مذکور کی ادبی تحریکات کے مرکز لاہور اور الہ آباد قرار پاگئے ہیں۔

اُردو کی ماں یعنی برج بھاشا کا اثر تو دہلی اور آگرہ تک ہی محدود تھا مگر ماں کی بیٹی کو خدا نے وہ شرف بخشا کہ آج شمالی ہندوستان میں تین لاکھ مربع میل پر اس کا دوردورہ ہے بلکہ جنوبی اور مغربی ہندوستان کے بعض وسیع اضلاع بھی اس کی حکومت سے آزاد نہیں اس کے علاوہ کئی مقامات میں مقامی بولیوں کے علاوہ اُردو گویا "زبان ثانی" تصور کی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے اُردو بولنے والوں کی تعداد کا صحیح اندازہ کرنا نہایت مشکل ہے باوجود اس اشکال کے ہم گریرسن صاحب کی تحقیقات کے مطابق زبان مذکور کے بولنے والوں کی تعداد درج کرتے ہیں اور صاحب موصوف کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ جنہوں نے از روئے کرم ہمیں اپنا مسودہ عطا فرمایا۔

پنجاب	۵۸۹۶۱۱
صوبجات متحدہ اور اودھ	۳۴۷۸۶۳۶۰
بنگال	۱۶۷۲۴۸۸
راجپوتانہ وغیرہ	۵۲۹۰۸۹
ممالک متوسط	۱۵۵۰۱۴
حیدر آباد	۲۷۰۴۰۰
بمبئی	۱۳۰۲۲۲
میزان	۸۰۰۴۲۸۳

مدراس کے اُردو بولنے والوں کی تعداد اس تعداد میں کچھ بہت بڑا اضافہ نہیں کر سکتی لہٰذا مندرجہ بالا تعداد کم وبیش ہندوستان کے خالص اُردو بولنے والوں کی سمجھی جانی چاہئے۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ جزئی طور پر اُردو زبان کی وسعت اِن حدود سے وسیع تر ہے۔ مثلاً پنجاب کے ایک کروڑ مسلمان باشندوں اور ایک کروڑ ۵۵ لاکھ مسلمان بنگالی بولنے والوں کے درمیان اُردو جزواً مروج ہے۔ مزید براں مندرجہ بالا ۸۰ لاکھ اُردو بولنے والوں میں غالباً لکھ پڑھ سکنے والوں کی تعداد اس قدر ہے کہ شاید کسی اور دیسی زبان کے بولنے والوں میں اس قدر نہ ہوگی۔ یہی حال اُن لوگوں کا ہے جو اردو کو بطور زبان ثانی استعمال کرتے ہیں۔ اِن لوگوں میں سے اکثر مثلاً اہل پنجاب نے اردو مدرسوں میں پڑھ کر سیکھی ہے۔

بعض مغربی مصنفین کی رائے ہے کہ اُردو ہندی سے کوئی الگ زبان نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی صرف ونحو کلیتہً ہندی اصل کی ہے۔ بیمز صاحب فرماتے ہیں کہ اُردو کو ہندی زبان سے متمیّز تصور کرنا غلطی ہے۔ اگرچہ ہندی بولنے والے مقامات میں مقامی بولیوں کے درمیان بہت سا اختلاف ہے تاہم ایک مشترک بولی متعارف ہے جس کو تمام تعلیم یافتہ لوگ استعمال کرتے

ہیں اس مشترک بولی کی ابتدا مضافات دہلی سے ہوئی اور ہندی کی وہ شکل جو اس شہر کے گردونواح میں بولی جاتی تھی رفتہ رفتہ ایک نئی زبان سمجھ کر اختیار کر لی گئی۔ بیمز صاحب ٹھیک فرماتے ہیں مگر وہ اس امر کو نظر انداز کرتے ہیں کہ اس نئی زبان کا اختیار کیا جانا ہی گویا اُردو زبان کی ابتدا تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو برج بھاشا شمال مغربی ہندوستان کے ایک تھوڑے سے حصے تک ہی محدود رہتی اور اس کی حیثیت ایک معمولی مقامی بولی کی حیثیت سے بڑھ کر نہ ہوتی۔ ڈاکٹر ہارنل نے ٹھیک کہا ہے کہ اُردو برج بھاشا کی ایک تبدیل شدہ صورت ہے جس نے بھاشا کی گردانوں کے اُلجھاؤ سے اپنے آپ کو آزاد کر لیا ہے۔ اور بعض صیغے جو پنجابی اور مارواڑی کے ساتھ مختص ہیں رکھ لئے ہیں پس اُردو بلحاظ صرف و نحو کے ہندی الاصل ہے جس میں کچھ مارواڑی اور پنجابی اجزاء بھی شامل ہیں اور بلحاظ الفاظ و اصطلاحات کے اس کی اصل کچھ ہندی ہے اور کچھ فارسی و عربی وغیرہ بلکہ اس کے مصنفین نے کئی غیر ملکی محاورات کا ہندی ترجمہ کر کے اپنی زبان کے ذخیرۂ محاورات کو زیادہ کیا ہے مثلاً محنت کھینچنا پھل لانا وغیرہ جو محنت کشیدن اور بار آوردن کا ترجمہ ہیں کتابی ہندی کی تو ابتدا ہی اس صدی سے ہوتی ہے یہ گویا اس اثر کا نتیجہ ہے جو انگریزی تعلیم نے زمانہ حال کے ہندوؤں پر کیا ہے۔ اگرچہ حقیقت میں یہ کتابی ہندی وہی اُردو ہے جس میں غیر ملکی الفاظ و محاورات کی جگہ تصنع سے ہندی محاورات اور سنسکرت کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہندی زبان بولنے والے ممالک کے تعلیم یافتہ ہندو کتابی ہندی کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں اور برج بھاشا بولنے والے اس کے فہم سے عاری ہیں۔ ہمارے نزدیک ڈاکٹر ہارنل نے جو اُردو مشرقی ہندی اور مغربی ہندی میں امتیاز کیا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ اور اُردو مشرقی اور مغربی ہندی سے اس طرح متمیز ہے جس طرح انگریزی ڈچ اور جرمن سے۔

فی زمانناانگریزی زبان کی طرزِ تحریر اُردو زبان پر بہت بڑا اثر کر رہی ہے۔ موجودہ اُردو اخبارات اور تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی بولی انگریزی زبان کے الفاظ و محاورات سے معمور ہوتی ہے۔ اگرچہ مستند اردو مصنفین کی تحریروں میں انگریزی الفاظ و اصطلاحات کو چنداں دخل نہیں ہے تاہم بہت سے الفاظ آہستہ آہستہ اُن کی تحریروں میں آتے جاتے ہیں۔ (مثلاً توبۃ النصوح کے مصنف نے الفاظ انٹرنس۔ ایم۔ فری مین۔ ربڑ پنسل ڈاکٹر وغیرہ کو استعمال کیا ہے) اور اُن کی طرزِ تحریر اور لکھنے کا ڈھنگ انگریزی طرزِ ادا سے متاثر ہوتا جاتا ہے۔ اِس اثر کا نتیجہ خود واضح ہو جائے گا۔ بیمز صاحب اس امر کے متعلق یوں پیشینگوئی کرتے ہیں۔

"غالباً گمان یہ ہے کہ ریلوں سڑکوں اور دیگر وسائل آمد و رفت کی توسیع سے پنجابی اور راجپوتانہ کی دیگر مقامی بولیاں معدوم ہو جائیں گی جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اٹک سے راج محل تک اور ہمالہ سے وندھیا چل تک ایک ہی زبان ہندی مفرس یعنے اُردو کا دور ہو جائے گا۔ اس وقت اِس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دس کروڑ سے بھی زیادہ ہو گی اور یہ زبان اپنی عظیم الشان وسعت اور روز افزوں رفعت کے باعث اپنی ہمسایہ بانوں پر بھی ایک بہت بڑا اثر ڈالے بغیر نہ رہے گی۔ جُوں جُوں مقامی اتحاد کے وسائل اور ملک کے مختلف حصص کے تعلقات بڑھتے جائیں گے توں توں یہ سادی شستہ بانکی اور ہر قسم کے مطالب کو ادا کر سکنے والی اُردو زبان جو ہندوستان کے اکثر حصّوں میں بولی جاتی ہے اور جو حکمراں قوم انگریزی زبان کے ساتھ خاص تشابہ رکھنے کے باعث بالخصوص مرغوب ہے ہندوستان کی اکثر دیگر زبانوں پر غلبہ حاصل کرتی جائے گی اور بالآخر وہ وقت آجائے گا۔ جب کہ تمام آریہ ہندوستان کی زبان ایک ہو جائے گی"۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو زبان اور انگریزی زبان کی تاریخ میں ایک عجیب و غریب مماثلت ہے

اور ولیم کو یہ شاعر انگلستان کے دلفریب الفاظ دونوں پر صادق آ سکتے ہیں۔
"اے انگلستان اس مدت مدید کے بعد بھی تیری زبان پر تیرے فاتحین کا اثر نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ شستگی بانکپن اور لطف ادا اس کے خاص جوہر ہیں اور یہ خیالات و الفاظ کے ان گرانمایہ موتیوں سے دمک رہی ہے جو تیرے فاتحین پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔"

پرانے لکھنؤ کی ایک جھلک

اکتوبر ۱۸۲۷ء میری ایک معزز دوست جو آج کل لکھنؤ میں مقیم ہیں۔ بادشاہ کے جشن تخت نشینی کی کیفیت اس طرح لکھتی ہیں۔

اٹھارہ اکتوبر کو بادشاہ کی تخت نشینی کی سالگرہ تھی اور میں بھی اس مبارک رسم میں شریک ہوئی تھی۔ اس تقریب کے اختتام کے بعد ہم بادشاہ کی والدہ کے محل میں گئے۔ جہاں تمام بیگمات اور شاہزادیاں آج مدعو تھیں۔ کہاریاں ہمارا تام جھام اُٹھا کر محل میں لے گئیں۔ دروازہ کے قریب اردا بیگنوں اور مغلانیوں کی ایک چھوٹی سی پلٹن مردانہ لباس پہنے ہاتھوں میں سونے اور چاندی کے عصا لئے ہماری تعظیم کے لئے صف بستہ کھڑی ہوئی تھی۔ بادشاہ بیگم صاحبہ (نصیر الدین حیدر کی والدہ) بہت سادہ پوشاک پہنے تھیں اور کسی قسم کا زیور بھی انکے بدن پر نہ تھا۔ شاہ متوفی کی ایک اور بیگم جو بہت کم سن اور خوبصورت تھی اُن کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ مگر اس کا لباس بھی بہت سادہ تھا کیونکہ یہاں کے دستور کے مطابق بیوہ عورتیں مکلّف پوشاک اور زیورات سے احتراز کرتی ہیں۔ بادشاہ حال کی بیگمات نہایت قیمتی اور نفیس پوشاکیں زیب بدن کئے ہوئے تھیں۔ اور بیش بہا جڑاؤ زیورات سے لدی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک بیگم بالخصوص ایسی حسین تھیں کہ میں نے اپنی یاد میں ہندوستان میں کہیں اُن سے زیادہ خوب صورت عورت نہیں دیکھی۔ بادشاہ آج کل اُن پر بہت فریفتہ ہیں اور اُن کی شادی بھی حال ہی میں ہوئی ہے۔ ان کا سن قریب ۱۴ برس کے ہوگا۔ ہاتھ پاؤں بہت چھوٹے اور نازک ہیں۔ اعضا کے تناسب کے علاوہ نقشہ ایسا سڈول ہے کہ میں نے اس سے زیادہ دلآویز اور دلکش

چہرہ کبھی نہیں دیکھا۔ اور اُن کو دیکھ کر بار بار میرا خیال مور شاعر کی مشہور ہیروان "لالہ رُخ" کی طرف جاتا تھا۔ ان کی حرکات اور طرز نشست سے غایت درجے کی مسکینی۔ حیا پروری اور حجاب مترشح تھا۔ پوشاک سُرخ کمخواب کی تھی اور بال بال میں موتی پروئے ہوئے تھے۔ زلفیں شانوں پر بکھری ہوئی تھیں۔ اور پیشانی پر ایک چھوٹا سا جھومر آویزاں تھا جس میں بڑے بڑے موتی اور زمرد جڑے ہوئے تھے۔ کانوں میں بہت سی بالیاں تھیں۔ جس میں بیشمار زمرد۔ لعل اور موتی جڑے ہوئے تھے گلے میں متعدد موتیوں کی مالاؤں کے علاوہ ہار اور کنٹھے تھے جو اُن کے حُسن کو دوبالا کرتے تھے۔ نتھ میں دو بڑے بڑے موتی اور ان کے بیچ میں ایک بیش قیمت زمرد آویزاں تھا۔

پشواز اس قدر بھاری تھی کہ کئی پیش خدمتیں اُسے سنبھالے ہوئے تھیں۔ جس کو نیچ پر یہ بیگم صاحبہ متمکن تھیں۔ اس کے گرد کئی خواصیں اس غرض سے استادہ تھیں کہ دوپٹہ کو درست کرتی رہیں۔ کیونکہ ذرا سی حرکت سے موتی کمخواب کے بھاری دوپٹے میں اُلجھ جاتے تھے۔ ان سے اور بیگمات بہت حسد کرتی ہیں۔ جس کا سبب یہ ہے کہ بادشاہ اور اُن کی والدہ دونوں ان پر ازبس مہربان ہیں۔ بادشاہ نے انہیں نواب تاج محل بیگم کا خطاب عنایت کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ خود نور جہاں بھی اس سے زیادہ حسین اور جمیل نہ ہوگی۔

ایک اور نئی بیاہی ہوئی بیگم اُن کے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ ایک انگریزی سوداگر کی بیٹی ہے[1] اس کی شکل صورت بہت معمولی ہے مگر یہاں کی مستورات اُسے بہت خوبصورت تصور کرتی ہیں۔ اس کی پوشاک بھی زیادہ پُر تکلف تھی۔ اور اس کی پیشانی پر بھی ایک بہت بیش قیمت مرصع جھومر الماس کا تھا۔ اس زیور کی شکل ہلال سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔ یہ بیگم خاص

[1] یہ بیگم دراصل ایک انگریزی افسر کی بیٹی ایک دو غلی عورت کے بطن سے ہے (بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۲)

تعلیم یافتہ ہے۔ یعنی اپنی مادری زبان انگریزی کے علاوہ اُردو بھی اچھی طرح لکھ پڑھ سکتی ہے۔ لیکن جب ہم نے اس سے انگریزی میں ہم کلام ہونا چاہا۔ تو اُس نے جواب دیا کہ میں اب انگریزی بھول گئی ہوں۔ سُنا جاتا ہے۔ کہ بادشاہ اس سے انگریزی پڑھتے ہیں۔ تاج محل سے شادی ہونے سے پیشتر بادشاہ اُسے بہت چاہتے تھے۔ باوجودیکہ یہ دونوں بیگمیں برابر ایک ہی کوچ پر بیٹھی تھیں جوشش رقابت ان دونوں میں اِس درجہ بڑھا ہوُا ہے کہ مطلقاً آپس میں بول چال نہیں ہوئی۔ نواب ملکہ زمانی بیگم جو صاحب اولاد ہونے کی وجہ سے بہت اقتدار رکھتی ہیں اِس صحبت میں شریک نہ تھیں۔ ہم خود اُن کے محل میں ملاقات کے لئے گئے خاندانِ مغلیہ کی شاہزادی جس سے کہ شاہ متوفی نے بادشاہ حال کی بچپن میں شادی کی تھی اپنے محل میں نظر بند ہے۔ بادشاہ اُن سے بہت کشیدہ خاطر تھے سُنا جاتا ہے کہ اُن کے حسن و جمال کو ان میں سے کوئی بیگم نہیں پہنچتی۔

نواب وزیر اودھ کے بادشاہ ہونے کی اصلی کیفیت یہ ہے کہ نواب سعادت علی خاں کے انتقال کے بعد اُن کے بیٹے مرزا غازی الدین حیدر نے اپنے نائب آغا میر کے صلاح و مشورہ سے شاہ دہلی کی اطاعت سے انحراف کیا اور سرکار انگلشیہ کی اجازت لے کر اپنی قلمرو میں سونے اور چاندی کا سکّہ اپنے نام سے جاری کیا۔ غازی الدین حیدر کے درصل کوئی لڑکا نہ تھا صرف ایک بیٹی تھی جو اپنے چچازاد بھائی سے منسوب ہوئی۔ اس لڑکے کا نام محسن الدولہ

بعد میں اس کی ماں نے ایک دولتمند مہاجن سے تعلق پیدا کر لیا تھا اسکی ایک اور بہن بھی ہے یہ دونو بہنیں جب اپنی ماں کے پاس رہتی تھیں تو اپنے گذارہ کیلئے دولتمند شرفا کے گھوڑوں کے زین پوش کاڑھا کرتی تھیں شکل صورت دونوں کی واجبی تھی لیکن ان میں سے ایک نے اپنی تصویر بادشاہ کو بھیجی۔ جس نے فریفتہ ہو کر اس سے شادی کر لی پھر تو روپیہ کی ریل پیل ہو گئی۔ اور اس نئی بیگم نے اپنے سوتیلے باپ یعنی اس مہاجن کو خزانچی مقرر کر لیا۔

ہے اور وہی دراصل اصلی وارث تاج و تخت ہے بادشاہ نے بجائے اس کے
کہ اپنے نواسے کو اپنا جانشین مقرر کرے یہ ظاہر کیا کہ نصیرالدین حیدر جو ایک
حرم کا لڑکا تھا اُن کا اصلی لڑکا ہے۔ یہ شخص آج کل بادشاہ ہے۔ انگریزی
حکام اس کے حسب و نسب سے اچھی طرح واقف ہیں۔ شاہِ حال کی وفات
پر جانشینی کا ضرور تنازع ہو گا۔ کیونکہ بجائے اصلی وارث فریدوں بخت مناجان
کے یہ ایک اور لڑکے کو جسے کیواں جاہ کا خطاب دیا ہے وارث مقرر کرنا چاہتا
ہے۔ نواب منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں آج کل وزیر اعظم ہیں۔ حاضری
کے وقت بھی اُن کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ حاضری کے بعد بادشاہ کا پیچوان نواب
کے سامنے لایا گیا۔ یہ بڑی بھاری عزت تصور کی جاتی ہے۔ کیونکہ رعایا میں
سے کوئی شخص بادشاہ کے سامنے حقہ نہیں پی سکتا۔ حاضری کے بعد بادشاہ
دوسرے کمرے میں گئے۔ یہاں ریزیڈنٹ نے حسب دستور بادشاہ
کی دستار اُتار کر تاج شاہی اُن کے سر پر رکھا اور بادشاہ تخت پر جلوس فرما ہوئے
آج تاریخ جلوس کی سالگرہ ہے۔ کیواں جاہ بڑا لڑکا جس کی عمر ۱۴ برس کی ہے
ایک بدشکل نیچ قوم کا لڑکا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے حرکات و سکنات سے
بھی کم اصل ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ اس نے سب سے پہلے بادشاہ کو نذر
دی اور چار پانچ خلعت رقوم جواہر مرصع تلوار ڈھال اور خنجر ہاتھی پالکی وغیرہ
اُسے عنایت ہوئے اس کے بعد فریدوں بخت جو ایک شکیل تیز طبع ہونہار
لڑکا معلوم ہوتا ہے نذر دے کر گیا۔ اس کو بھی اسی طرح کا سامان خلعت میں
مرحمت ہؤا۔ اب نواب حکیم مہدی پیش ہوئے دستار مع سرپیچ مرصع شال
وخلعت عطا ہؤا۔ اُنھوں نے نہایت ادب سے جھک کر تسلیمات عرض
کی۔ جب محسن الدولہ وارث حقیقی نذر دینے کے لئے آگے بڑھے تو بادشاہ کا
چہرہ مکدر معلوم ہوتا تھا۔ اور اس چہرہ پر افسوس و رنج کی علامات نمایاں تھیں
محسن الدولہ بہت وجیہہ خوب صورت جوان ہے اور نہایت ذکی اور تیز فہم ہے مجھے

یہ امر بہت ناگوار معلوم ہوا کہ اصلی وارث ایک نامنصفانہ رواج کی پابندی کے سبب سے غیر مستحق شخص کو نذر دے اور اپنا بادشاہ تسلیم کرے۔ اختتام رسم کے اختتام کے وقت جواہرات کی بوچھاڑ ہوئی۔ رزیڈنٹ کی اور میری استین پر چند جواہر آ پڑے تھے۔ میں نے ریزیڈنٹ کو آستین جھٹکتے ہوئے دیکھ کر اس کی تقلید کی اور جواہرات زمین پر پھینک دیئے۔ شاہی خواصوں نے سب جواہرات سمیٹ کر باہم تقسیم کر لئے۔ اس بوچھاڑ میں زمرد پکھراج نیلم اور ہیرے تھے۔ کیسی قیمتی اور تعجب خیز بخشش ہے۔

سر برام

شیلی

روم مٹ گیا لیکن اس کی عظمت وشان کی یادگاریں باقی ہیں۔ پرانے رومیوں کی وسیع فتوحات کے نشان اور ان کی تہذیب کے لٹے مٹے آثار چپّے چپّے پر سیّاح کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کر لیتے ہیں۔ اور ایک سرد آہ یا ایک ہمدردی کے آنسو کا خراج طلب کرتے ہیں۔ ان یادگاروں میں شاید سب سے زیادہ قابل ذکر اُن بہادروں کی قبریں ہیں جنھوں نے اپنا خون پانی ایک کرکے روم کو رومۃ الکبریٰ بنایا تھا اور اس کی رفعت وشان کو ساری دنیا سے منوایا تھا۔ روم کے قبرستان ایسے لوگوں کی نعشوں سے پُر ہیں جن میں سے ہر ایک بجائے خود اپنے ملک کے لئے سرمایۂ ناز تھا۔ اور جن کے نام اِس وقت صرف ایک وجہ سے مٹ گئے ہیں کہ انکی شہرت کو چند بزرگتر ناموں نے اسی طرح گھٹا دیا ہے۔ جس طرح کہ چھوٹے چھوٹے ستارے آفتاب کی شعاعوں کے سامنے ماند پڑ جاتے ہیں۔ اِسی مردم خیز شہر کے ایک مشہور قبرستان میں جس میں اہرام کائس سٹس واقع ہے۔ ایک شمالی گلشن کے بھی دو دور اُفتادہ پھول دفن ہیں۔ جن کی مہک اس وقت تعلیم یافتہ دنیا میں ہر طرف پھیل رہی ہے۔ ان میں سے ایک تو انگلستان کا ہونہار شاعر کیٹس ہے۔ جس کی شاخ زندگی کو پھل لانے سے پہلے ہی موت کے تیز و بیرحم چاقو نے قطع کر دیا۔ اور دوسرا وہ شاعر عندلیب صفت ہے جس کا نام زیب عنوان ہے وہ مقام جہاں ایک پتھر کی قبر پر لاطینی میں لفظ کارِ ڈیم یعنے "دلِ دلہا" کندہ ہیں۔ ہر ایک شاعری کے دلدادہ کے لئے متبرک مقام ہے۔ کیونکہ اس قبر میں اس شخص کی خاک دفن ہے جسے اگر فخر روزگار کہیں تو بجا ہے۔ وہ اُن لوگوں میں

سے ہے جن کو روم کی پاک سر زمین میں دفن ہونے سے کوئی فخر نہیں بلکہ جن کی خاک پر خود روم کو بھی ناز ہونا چاہیئے ہم جرأت اور یقین کے ساتھ روم سے سوال کر سکتے ہیں کہ یوں تو تیری خاک میں لاکھوں ہی گہر پنہاں ہیں۔ لیکن تو ہی بتلا کہ۔ ؎

دفن تجھ میں کوئی فخر روزگار ایسا بھی ہے
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے

پرسی بیشی شیلے۔ انگلستان کے ایک پرانے امیرانہ گھرانے میں ۱۷۹۲ء میں پیدا ہوا۔ اس کے آباؤ اجداد طبقۂ شرفا میں شمار کیے جاتے تھے اور اکثر اعلیٰ اعلیٰ عہدوں پر ممتاز رہے تھے۔ شیلے کی پیدائش کے وقت اس کا دادا جسے بیرونٹ کا خطاب حاصل تھا۔ خاندان کا سرپرست تھا اور اس کا باپ پارلیمنٹ کا ایک سر برآوردہ ممبر تھا۔ شیلے کو شروع سے تعلیم و تربیت کے عمدہ مواقع حاصل تھے۔ لیکن بچپن ہی سے اس کی بچپن طبیعت ہر قسم کی قیود سے اپنے تئیں آزاد کرنے کی خواہشمند تھی اس کا رنگ ڈھنگ گھر میں بالکل نرالا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ "ولد سر لابیہ" مگر یہاں معاملہ برعکس تھا۔ مسٹر ٹیموتھی شیلے (پرسی کے باپ) اور پرسی کی اپنی طبیعت میں بعد المشرقین تھا۔ پرسی کا باپ ایک معمولی عقل کا بھاری بھرکم مالدار آدمی تھا۔ لیکن پرسی کے دل میں وہ شعلہ پنہاں تھا۔ جو خاص آسمانی نور کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے۔ اس نے قدرت سے شاعرانہ طبیعت پائی تھی۔ اور علاوہ شاعرانہ طبیعت کے اپنی بنی نوع کی ہمدردی اس کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھی۔ جسمانی خوب صورتی اس نے اپنی ماں سے ورثے میں پائی تھی۔ جو غالباً ایک ذہین اور قابل عورت تھی۔ اس کے خط و خال نازک تھے اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر روشن اور چمکدار تھیں اور اس کے اعصاب نہایت کمزور اثر پذیر تھے اسکی آواز البتہ نہایت تیز اور مہین تھی۔ اور بسا اوقات کانوں کو ناگوار گذرتی تھی۔

شیلے کی انسانی ہمدردی کچھ ابناء السبیل تک ہی محدود نہ تھی بلکہ اُس کے اپنے خویش و اقارب بھی اس میں حصّہ لیتے تھے۔ اس کو اپنے سب عزیزوں سے محبت تھی۔ اپنے باپ سے اوائل عمر میں خاصی موانست تھی۔ ایک مرتبہ جب ٹیمو تھی شیلے سخت بیمار ہوئے تو پرسی رات کو اپنے بچھونے میں سے نکل کر اکثر ان کی خبر لینے جاتا تھا۔ اور گھنٹوں اُن کے کمرے کے دروازے سے لگا کھڑا رہتا۔ لیکن سب سے زیادہ شفقت اسے اپنی بہنوں پر تھی۔ اور اس کا اکثر وقت انہیں کی ہمراہی میں کٹتا تھا۔ انہی آرام دینے کے لئے وہ خود تکلیف کا متحمل ہو جاتا تھا۔ اور جس طرح بھی بن پڑتا تھا۔ اُنہیں خوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس برادرانہ محبت کا اس کی شاعری پر بہت بڑا اثر پڑا۔ جس عزت و وقعت کی نگاہ سے وہ طبقہ اناث کو دیکھتا تھا۔ اس کا پتہ لگنے کے لئے ہمیں اس کے شروع کے حالات پر نظر ڈالنی چاہئے۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اپنی بہنوں کی بڑھی ہوئی محبت نے ہی اس کو عورتوں کی عزت کرنے کا پاک اصول سکھلایا تھا۔

شیلے کی ابتدائی تعلیم برانٹ فورڈ۔ اور بعد ازاں ایٹن کے مشہور آفاق سکول میں ہوئی۔ دونوں جگہ اُس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا گیا۔ کیونکہ استاد اور ہم مکتب دونوں اس پُر اسرار لڑکے کو سمجھنے اور سمجھ کر ہمدردی کرنے سے قاصر تھے شیلے کی عادات اور خصائل عجیب و غریب تھیں۔ اور خواہ مخواہ اُسے ہر کہ و مہ کی نظروں میں مشتبہ اور حقیر بنائے دیتی تھیں۔ مدرسے کی باقاعدہ تعلیم سے اسے مطلق ہمدردی نہ تھی گو لاطینی و یونانی شعراء کا کلام اکثر اُس کے زیر مطالعہ رہتا تھا خصوصاً موخرالذکر زبان کے علم و ادب کا اُسے بے حد شوق تھا شیلے کو بعید از قیاس افسانوں۔ اور سحر و طلسمات کی داستانوں سے بھی بہت دل بستگی تھی اور اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کی کتابوں کے مطالعہ سے اُسے اپنی قوت متخیلہ کی ترقی میں بہت مدد ملی۔ لیکن ان کا ایک برا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ

وہ ان میں سے اکثر لچر باتوں پر یقین کرنے لگا اور کیمیا گری اور ساحری کا شوق ہو گیا۔ اس کا اکثر وقت علم کیمیا کے خطرناک تجربوں میں گذرتا تھا۔ جن کی وجہ سے وہ اضحوکۂ روزگار بن گیا اس کے ہم مکتب اسے حقارت بلکہ نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے اور آزار دینے پر کمربستہ ہو گئے۔ سارا مدرسہ ایک طرف تھا اور بیچارہ شیلے ایک طرف۔ مجنوں شیلے کے نام سے اسے خطاب کرتے تھے۔ اور رنج دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بسا اوقات مار پیٹ سے بھی نہ چوکتے تھے۔ اس قسم کے سلوک اور برتاؤ کا جو اثر شیلے جیسی نازک طبیعت کے لڑکے پر ہو سکتا ہے۔ وہ واضح ہے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ ابتدا ہی سے اسے ہر قسم کی قیود سے نفرت تھی۔ اب وہ ہر ایک قسم کی حکومت اور افسری کو ظلم اور غضب سے تعبیر کرنے لگا اور با اختیار لوگوں کے جبر و تعدی اور ناانصافی کا نقش اس کے دل پر خوب جم گیا۔ انسانی آزادی اور ہمسری کے تکلیف دہ خیالات اس کے دل میں جوش مارنے لگے۔ اس زمانے کی ہوا ہی میں کچھ یہ تاثیر تھی۔ ہر طرف انسانی ہمدردی کی صدائیں بلند تھیں۔ اور ہر ایک فرد بشر کو مساوات اور برابری کی نگاہ سے دیکھنے کا سبق یورپ کے ہر ملک میں پڑھایا جا رہا تھا۔ فرانس کی بغاوت اسی فلسفہ کا نتیجہ تھی بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ یہ فلسفہ ہی خود ایک بغاوت کے آنے کی خبر دیتا تھا۔ جس میں کہ یہ اصول زبان اور قلم کے ذریعہ سے نہیں۔ بلکہ زبانِ تیغ اور دہن توپ کے ذریعہ سے دنیا کو تعلیم کئے جائیں گے۔ شیلے کی اس زمانے کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے۔ کہ اس کی زندگی تلخ ہو گئی تھی۔ اور دنیوی مظالم و مصائب کا خیال ہر وقت اس کی طبیعت میں خلش پیدا کرتا رہتا تھا۔ ہر قسم کی انسانی قیود یہاں تک کہ مذہب اور رسم و رواج کی کڑی زنجیر بھی اس کی نظروں میں انسانی ترقی کی سدِ راہ معلوم ہوتی تھی۔ اور اس نے اپنے دل سے عہد کر لیا۔ کہ میں ان میں سے کبھی کسی قید کا نہ تو پابند ہوں گا اور نہ ان کی عزت کروں گا۔ کیونکہ یہ سب انسان

نے خود اپنی نوع پر بیجا تشدّد اور تحکم کی غرض سے قائم کر رکھی ہیں اور خدا کی ذات والاصفات سے انہیں کچھ تعلق نہیں ہے۔ اس قسم کا خیال بیجا جرأت ہے میرا انہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ بجائے خود ایک مجرمانہ خیال ہے۔ لیکن شیلے کے حق میں جو نتائج اس سے مرتب ہوئے اُن کے سامنے ہم تھوڑی سی کم فہمی اور کوتاہ نظری کو بہ آسانی معاف کر سکتے ہیں۔

سکول کی ابتدائی تعلیم سے فارغ ہو کر یونیورسٹی کا ارادہ ہوا۔ آکسفورڈ کے یونیورسٹی کالج میں شیلے کے اکثر بزرگوں نے تعلیم پائی تھی۔ چنانچہ وہ بھی کالج میں داخل کیا گیا۔ اور بطور ایک انڈر گریجوائٹ کے یونیورسٹی کی ابتدائی تعلیم پانے لگا۔ یونیورسٹی میں آنے سے اُسے دو فوائد حاصل ہوئے ایک تو یہ کہ چند ہم مذاق احباب مل گئے۔ اور دوسرے پہلے کی نسبت زیادہ آزادی اور تنہائی میسر آگئی۔

لیکن شیلے جیسی طبیعت کو کہاں چین پڑتا ہے۔ انہیں تو ع

بہر زمین کہ رسیدیم آسمان پیداست

ہر جگہ کہنا پڑتا ہے۔ آکسفورڈ میں جبر و تشدد مفقود نہ تھا۔ اور اکثر پروفیسر سکول کے اُستادوں کی نسبت کچھ چنداں سلیم الطبع یا خوش مزاج نہ تھے۔ اِس پر طرفہ یہ ہوا کہ شیلے صاحب کو اپنی ایک رشتہ دار لڑکی ہیریٹ گرو نامی سے بہت کچھ اُنس ہو گیا تھا۔ لیکن اس کے والدین کو ان دونوں کی شادی منظور نہ ہوئی اور اس کی نسبت ایک اور جگہ ٹھہر گئی۔ شیلے کی طبیعت پر اس واقعہ سے بہت صدمہ ہوا۔ اور ذی اختیار لوگوں کی نا انصافی کا اور بھی زیادہ یقین ہو گیا۔ ان دنوں طبیعت مذہب کے انجھیڑوں کی طرف زیادہ مائل تھی۔ ایک رسالہ خدا کو نہ ماننے کی ضرورت پر لکھ مارا۔ اور اس کی ایک ایک جلد سب یونیورسٹی کے عہدہ داروں کے پاس تبلیغ حق کی نیّت سے بھیجدی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یونیورسٹی سے بیک بینی و دو گوش نکالے گئے۔ اس حرکت کو ہم صرف کم عمری اور حماقت

بہی محمول کر سکتے ہیں خصوصاً اس وجہ سے کہ شیلے دراصل ایک اعلیٰ و ارفع ذات کا قائل اور خدا کی ہستی کو ماننے والا تھا۔ اُسے اگر کچھ پرخاش تھی تو عیسائیوں اور ہودیوں کے خدا سے۔ جس پر (اس کے خیال کے بموجب) ظالم و جابر ہونے کا احتمال ہو سکتا ہے لیکن ایسے باریک و فلسفیانہ نکتے۔ اکثر یونیورسٹیوں کے انتظام میں خلل ڈالتے ہیں۔ اور ہمارے خیال میں جو سزا شیلے کو ملی وہ کچھ بیجا نہ تھی۔ تاہم ہمیں اس کی اخلاقی جرأت کی تعریف کرتے ہی بن پڑتی ہے۔

یونیورسٹی سے نکلتے ہی باپ بیٹوں میں ناچاقی ہو گئی۔ مسٹر سیٹمو تھی شیلے چاہتے تھے کہ شیلے نادم ہو کر اپنے کئے سے تائب و پشیمان اور یونیورسٹی کے افسروں سے معافی کا خواستگار ہو۔ لیکن شیلے کا یہ زعم تھا کہ ع

یہ وہ نشے نہیں جنہیں ترشی اُتار دے

دونوں میں ایک عرصے تک خط و کتابت کے ذریعے سے بحث ہوتی رہی کیونکہ شیلے ان دنوں اپنے ایک دوست کے ہمراہ گھر سے دور لنڈن میں براج رہے تھے۔ لیکن نتیجہ کچھ نہ ہوا۔ وہ اپنی ضد پر قائم یہ اپنی ہٹ پر تُلے رہے ہمیں اس اُنیس سالہ لڑکے پر حیرت ہوتی ہے جو اتنی سی عمر میں یہ دم داعیہ رکھتا تھا کہ ع

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہو

لنڈن میں ایک نیا گل کھلا۔ شیلے کی بہنیں لنڈن کے ایک زنانہ سکول میں تعلیم پاتی تھیں اور ان کا بھائی اکثر اُن سے ملنے جایا کرتا تھا اسی سکول میں ایک اور شانزدہ سالہ لڑکی ہیریٹ وسٹ برک نامی بھی پڑھتی تھی۔ جس کا شیلے کی بہنوں سے بہت کچھ ارتباط و اتحاد تھا۔ قدرتی طور پر شیلے اور ہیریٹ کو اکثر ایک دوسرے سے ملنے کا اتفاق پیش آتا رہتا تھا۔ بلکہ بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ ہیریٹ شیلے کے پاس اُس کی بہنوں کی طرف سے پیغامبر بن کر آتی تھی۔ ہیریٹ کا باپ ایک سخت گیر اور بدمزاج آدمی تھا۔ اور وہ بیچاری اکثر

اس کے ہاتھوں سے نالاں رہتی تھی۔ شیلے کو اس بدنصیب لڑکی سے ہمدردی سی ہوگئی اور رفتہ رفتہ اس ہمدردی نے محبت کی صورت اختیار کر لی۔ ہیریٹ کے باپ کو بھی اس شادی میں کوئی اعتراض نہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ وہ ایک ادنیٰ درجے کا آدمی تھا۔ اور شیلے جیسے عالی نسب کے ساتھ رشتہ ناطہ کرنا اس کے لئے عین عزت و افتخار کا باعث تھا۔ لیکن ان دونوں نے مسٹر وسٹ برک کی اجازت کا بھی انتظار نہ کیا اور چپکے چپکے شادی کر لی۔ یہاں اتنا بیان کر دینا ضروری ہے کہ شیلے کو اُس وقت تک ہیریٹ کی طرف سے بالکل اطمینان نہ تھا۔ اور اتنی جلدی شادی کرنے کی محض یہ وجہ ہوئی کہ ہیریٹ نے ایک دن اپنے باپ کی بدسلوکی کی بہت شکایت کی اور یہ کہا کہ میں سخت مصیبت میں گرفتار ہوں۔ شیلے کا شاعرانہ دل موم ہوگیا۔ اور وہ حبالۂ ازدواج میں بندھ گیا۔ شادی کی خبر سُن کر مسٹر سیٹمو تھی شیلے اپنے بیٹے سے بالکل دست بردار ہوگئے اور نو کتخدا میاں بی بی کو مفلسی کا سامنا کرنا پڑا۔ کچھ عرصہ تک اِدھر اُدھر پھرتے رہے۔ اس کے بعد آئرلینڈ میں ناراض رعایا کی گورنمنٹ کے خلاف مدد کرنے کی غرض سے چلے گئے۔ وہاں کچھ عرصے تک مقیم رہے۔ اور شیلے آزادی کے حامیوں کی دامے، درمے، قدمے، سخنے، مدد کرتے رہے۔ اور بالآخر اپنے تئیں گورنمنٹ کی نظروں میں مشتبہ بنا کر مجبوری واپس ہوئے اور آکر دوبارہ لنڈن میں رہائش اختیار کر لی۔

اثنائے سفر ہی میں میاں بی بی میں کچھ نا اتفاقیاں شروع ہوگئی تھیں خصوصاً اس وجہ سے کہ ہیریٹ کی ایک بہن الائنزا ہر وقت سر پر مسلط رہتی تھی۔ اور شیلے کو یہ دخل درمعقولات نہایت ناگوار گذرتا تھا۔ لنڈن پہنچتے پہنچتے شیلے کے دل میں ہیریٹ کی طرف سے کچھ بے لطفی سی پیدا ہوگئی اور اس کے خیالات میں بہت کچھ تغیر ہوگیا۔ لنڈن میں آکر ایسے سامان پیش آئے جن کی وجہ سے یہ بے لطفی رفتہ رفتہ لاپرواہی بلکہ نفرت سے مبدل ہوگئی۔ شیلے کے دل میں ہیریٹ

کے سوا ایک اور نے گھر کر لیا جو ہیریٹ کے برابر حسین اور ہیریٹ سے بدرجہا زیادہ لائق اور ذہین لڑکی تھی۔

لندن میں ان دنوں ایک شخص ولیم گاڈون نامی رہتا تھا جس کی زندگی دُوکانداری اور فلسفے جیسے دو مخالف و متباعد مشاغل میں گذرتی تھی۔ اس دُکاندار فیلسوف کی کتابیں آزادی کی کچھ بیجا اور بیجا چیخ پکار کی وجہ سے بہت مقبول اور ہر دلعزیز بن رہی تھیں شیلے کو بھی اس سے زیادہ عقیدت تھی۔ اور خط و کتابت کے ذریعے سے عقیدت کا اظہار بھی ہو چکا تھا۔ پہلا کام جو شیلے نے لندن میں آکر کیا وہ یہ تھا کہ تقدس آب حضرت گاڈون کی زیارت سے مشرف ہوا۔ اس گاڈون کی ایک نوجوان بیٹی میری نامی بھی تھی جس نے ذہانت اور حسن اپنی ماں سے اور فلسفہ اپنے باپ سے میراث میں پایا تھا۔ میری گاڈون کے خیالات انسانی تعلقات کے بارے میں بہت کچھ اپنے باپ سے ملتے جلتے تھے دونوں رسم و رواج کی قیود کو انسانی ترقی کے سدّ باب تصوّر کرتے تھے۔

شیلے کو اس لڑکی کی گفتگو اور صحبت میں وہ دنیا نظر آئی جس کی اُسکی آنکھوں نے کبھی پیشتر سیر نہ کی تھی۔ دونوں خود بخود ایک دوسرے کی طرف کھنچنے لگے اور دونوں نے ایک دوسرے میں اپنا سچّا مشیر مددگار پالیا۔ میری شیلے کا اجتماع دو روحوں کا اجتماع تھا۔ اور ایسے ہی اجتماع کو ہم سچّی شادی کہہ سکتے ہیں شادی کی رسم کو دونوں فضول بلکہ مضر خیال کرتے تھے۔ خود گاڈون ہی کی یہ تعلیم تھی۔ اس لئے کسی سے کچھ کہے سُنے بغیر دونوں ایک دن بُوئے گل کی طرح فرار ہو گئے۔ اور اُدھر گاڈون اور ادھر ہیریٹ ہاتھ ملتے رہ گئے شیلے کا یہ فعل ہم لوگوں کی نظروں میں کس قدر معیوب کیوں نہ ہو۔ اس میں کلام نہیں کہ اس جیسی طبیعت اور اس جیسے خیالات والے شخص سے ایسے حالات میں محصور ہو کر یہی توقع ہو سکتی تھی۔ ہیریٹ کی طرف سے اُسے پہلے ہی بیزاری پیدا ہو گئی تھی۔ دُنیا کی نفرین اور تعریف کی اسے چنداں پروا نہ تھی۔ اس پر یہ

بات مزید ہوئی کہ ایک ہم خیال اور ہمدرد رفیق مل گئی جو ساری عمر اس کا ساتھ دینے پر تیار تھی دونوں نے دنیا کی رائے کو بالائے طاق رکھ دیا اور جو اپنے جی میں آیا کر گذرے۔

شیلے کی زندگی کے اس واقعہ پر مخالف و موافق تحریروں سے دفتر کے دفتر سیاہ کئے گئے اور بعض معتبر سوانح نویسوں نے ہیریٹ کے چال چلن پر بھی حرف رکھا ہے۔ ہم لوگ جو ان سب معاملات کو دوسروں کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ واللہ اعلم بالصواب لیکن اس میں کلام نہیں کہ میری کے نمودار ہونے سے پہلے ہیریٹ اور شیلے کا نباہ مشکل ہو گیا تھا۔ اور ان دونوں میں علیحدگی کا ہونا لازمی اور لابدی تھا۔ اس ناگوار تذکرے کو ہم یہیں ختم کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ صرف اور اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ ہیریٹ نے سال کے اندر ہی اندر کوئیں میں ڈوب کر خودکشی کر لی اس وقوعہ کا شیلے کے دل پہ بہت برا اثر ہوا۔ اور اس کی آئندہ زندگی کو ہیریٹ کا خیال اکثر تلخ کر دیتا تھا۔

دوسری شادی کے بعد شیلے نے انگلستان کو خیرباد کہا اور اٹلی میں (جو اکثر انگریز شاعروں کا دوسرا وطن رہا ہے) رہائش اختیار کر لی۔ اس عرصے میں اس کی شاعری کو اکثر لوگ مان گئے تھے۔

میری جیسی مونس و دمساز کے مل جانے سے شیلے کی شاعرانہ طبیعت اور بھی چمک گئی۔ وہ بات جو مضمون سمجھاتی اور دل کو گرماتی ہے۔ اب اسے حاصل ہو گئی تھی۔ دونوں میاں بی بی ہم مذاق تھے۔ دونوں کو علمی ذوق تھا دونو کے دل میں اپنی بنی نوع کا درد جاگزیں تھا۔ ان حالات میں تو کوئی معمولی شخص بھی آدھا پونا شاعر بن جاتا پھر شیلے کا تو کیا مذکور جسے خدا نے پیدائش ہی سے حلیۂ شاعری عطا فرمایا تھا۔ ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر نظم شائع ہونے لگی۔ اور شائقین کے ہاتھوں میں گردش کھانے لگی۔ تنقیدی دنیا کے کان کھڑے

ہوئے۔ کہ دنیا کا ایک سب سے بڑا شاعر انگلستان میں نمودار ہوا ہے۔ شیلے کی نظموں میں جو بات خصوصیت سے قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ ان میں ایک قسم کا قدرتی ترانہ اور شیرینی پائی جاتی ہے جس کی مثال دنیا کی شاعری میں اور کہیں نہیں مل سکتی اس کی نظموں کے سُننے سے کان کبھی سیر نہیں ہوتے بلکہ ہمیشہ "ہل من مزید" کی تمنا رہتی ہے۔ بجائے شاعری کے اُنہیں اگر موسیقی کہا جائے۔ تو بجا ہو گا۔ کیونکہ شاعری اور موسیقی کا اجتماع جس قدر شیلے کی نظموں میں پایا جاتا ہے۔ اسقدر اور کسی شاعر کے کلام میں نہیں پایا جاتا۔ علاوہ اس ترانے کے اس کا بڑھا ہوا تخیل خاص اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ شیلے جس دنیا کی سیر کرتا تھا وہ خلد بریں کی طرح خوبصورت تھی۔ اس میں ہر ایک چیز قوس قزح کے رنگوں سے مزین نظر آتی ہے اس کا پتہ پتہ صنعت کردگار کا ایک اعلےٰ نمونہ ہے۔ اس کا آسمان نیلم کو شرماتا ہے اس کی زمین ہمسر فلک ہے۔ اس کا سمندر آبی پریوں کا مسکن ہے۔ جس کی ہر ایک موج بجائے خود ایک مہ جبین ہے جو اپنے سیمیں بازو پھیلا کر ہمیں اپنی آغوش میں بلاتی ہے۔ اس کے طیور خوش الحان کی موسیقی ستاروں کو وجد میں لاتی ہے اور اس کے باشندے ہم جیسے خطا و نسیان سے مرکب۔ گناہوں سے ملوث آدمی نہیں۔ بلکہ خوب صورت اور خوب سیرت لوگ ہیں جو فرشتوں کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتے ہیں اور جنہیں اشرف المخلوقات کہلانے کا پُورا پُورا حق حاصل ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ اس خیالی دنیا کی سیر میں شیلے اکثر واقعیت کو ہاتھ سے دے دیتا ہے۔ لیکن شاعری کا صرف یہی منشا نہیں کہ واقعات کو پیش کرے بلکہ ہر ایک شے میں حُسن کا مطالعہ کرے۔ اور اس منشاء میں جس قدر کامیابی شیلے کو ہوئی ہے۔ اس قدر اور کسی شاعر کو نہیں ہوئی کیونکہ وہ خدا کو بھی حسن ازلی ہی سے تعبیر کرتا تھا اور کل کائنات کو حُسن مجسم خیال کرتا تھا۔

شیلے نے جو حصّہ عمر اٹلی میں گذارا۔ اُس میں دو واقعات قابلِ ذکر ہیں۔

ایک تو لارڈ بائرن اور شیلے کی پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی اور بہت گہری ملاقات ہوئی کیونکہ دونوں ایک عرصہ تک ساتھ رہے۔ اس ملاقات کا اثر دونوں کی شاعری پر پڑا۔ چنانچہ شیلے نے ایک نظم موسوم بہ "جولین اینڈ میڈالو" اسی تقریب پر لکھی ہے۔ دوسرا امر جو ہمارے لئے دلچسپی کا موجب ہے وہ یہ ہے کہ شیلے کی ملاقات عجیب وغریب عورت ایمیلیا دیونانی نامی سے ہوئی جو اپنی مذہبی آرائے کی وجہ سے خانقاہ پیسا میں نظربند تھی۔ شیلے جیسے آزاد خیال شخص کو ایسی عورت سے ہمدردی پیدا ہونی ضروری تھی اور اس پر یہ بات مزید تھی کہ ایمیلیا دیونانی واقعی نہایت ذہین اور قابل عورت تھی۔ شیلے اس کی بیوی میری اور ایمیلیا تینوں میں بہت دلی دوستی ہو گئی اور یہ دونوں میاں بیوی اکثر اس سے ملنے جایا کرتے تھے۔ ہمارے شاعر کی ایک مشہور نظم "اےپی سائی کڈیاں" اسی ایمیلیا دیونانی ہی کے شوق میں لکھی گئی ہے۔

جو زمانہ اٹلی میں گذرا اس کو ہم شیلے کی عمر کا بہترین حصّہ کہہ سکتے ہیں لیکن افسوس یہ کچھ بہت لمبا نہ تھا۔ انگریزی میں ایک مثل ہے کہ "وہ جن سے دیوتا محبت کرتے ہیں۔ جوان ہی مرجاتے ہیں"۔ شیلے بھی انہیں منتخب چند میں سے ایک تھا۔ ایک روز کشتی میں سوار ہو کر لک ہارن کے قریب سمندر کی سیر کر رہا تھا کہ طوفان نے آلیا۔ شیلے کی کشتی میں صرف ایک شخص مسٹر ولیم نامی اور تھا باقی سب دوست اور کشتیوں میں تھے۔ طوفان کی تاریکی میں کچھ پتہ نہ چلا کہ کون کدھر جاتا ہے۔ آخر جب طوفان گذر گیا تو معلوم ہوا کہ شیلے کی کشتی کا پتہ نہیں بڑی تلاش سے دو تین دن کے بعد اس جوان مرگ کی نعش ساحلِ سمندر پر ریت میں دبی ہوئی ملی۔

اٹلی کا ایک قانون تھا کہ جو نعش وغیرہ ریت میں دبی ہوئی ملے اسے وہاں سے اُٹھایا نہ جائے۔ اس لئے لارڈ بائرن اور شیلے کے دیگر دوستوں کی یہ صلاح ہوئی کہ پہلے نعش کو جلایا جائے اور پھر راکھ کو دفن کر دیا جائے۔

لاش کو جلانے کا نظارہ نہایت عبرت خیز اور دردانگیز تھا۔ شیلے کے ایک دوست (لیتھ ہنٹ) نے اس وقت کی چشمدید کیفیت مندرجہ ذیل الفاظ میں قلمبند کی ہے "بحیرہ روم جواب بالکل با امن اور صاف تھا۔ ساحل کے بوسے لے رہا تھا گویا کہ اپنا صلح کا پیام دیتا تھا۔ زرد ریت اور نیلا آسمان عجیب انداز سے ایک دوسرے کے مقابل نظر آرہے تھے ٹھنڈی ہوا پہاڑوں کی چوٹیوں کو چھوتی ہوئی گذر جاتی تھی۔ آگ کے شعلے آسمان کیطرف زور و شور سے بلند ہو رہے تھے اور اُن کے کپکپانے اور ہلنے سے ایک عجیب ناقابل بیان چمک پیدا ہوتی تھی"

ایک بات جو خصوصاً اس واقعہ کے متعلق قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ شیلے کا دل شعلوں کی دستبرد سے محفوظ رہا اور راکھ میں سے صحیح و سالم نکالا گیا۔

آہ آگ کے بے رحم شعلے بھی شاعر کے نازک دل کی قدر کرتے ہیں لیکن اے موت! تیرا تیر کسی کو نہیں چھوڑتا۔

محمد سعید

ٹوپی

آج کل جو بعض نہایت اہم مسئلے ہندوستان میں اہل الرائے حضرات کے روبرو ہیں اُن میں ایک یہ ٹوپی کا مسئلہ بھی شامل ہے قانون راز داری قانون اصلاح تعلیم۔ تقسیم بنگالہ۔ یہ سب ضروری مبحث ہیں۔ مگر ٹوپی کسی سے کم نہیں وہ مسائل تو محدود حلقوں پر اثر رکھتے ہیں لیکن اس کا اثر عام ہے ممکن ہے آپ نے نہ سُنا ہو کہ ٹوپی کا مسئلہ نہایت اہم خیال کیا جاتا ہے۔ مگر آپ کے نہ سُننے سے کچھ اُس کی اہمیت میں فرق نہیں آتا۔ یہ سب مسئلوں کے سر پر ہے۔ اسی کا آج کل راج ہے۔ پگڑی بیچاری اس کے مقابلے میں گر گئی ہے۔ چند دوراندیش خیر خواہان ملک جانتے ہیں کہ ہندوستان کے لئے پگڑی ضروری ہے۔ خدا وہ دن نہ دکھائے کہ اس کی پگڑی اُتر جائے مگر لوگ انہیں دقیانوسی سمجھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں ؎

کہ دستار جز پیچ بر پیچ نیست
بہ عاقلاں جُز کلہ پیچ نیست

کیوں نہ ہو۔ سعدی سے بھی خوب کام لیا۔ اگر آج شیخ شیرازی زندہ ہوتا تو داد دیتا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ گلستان کے لئے بھی بعض اور کتابوں کی طرح تحریف کی ضرورت پڑے گی۔ غرض ٹوپی کی طرفداری میں ہر طرح کے ذرائع استعمال کئے جاتے ہیں۔ مگر ٹوپی ہے کہ عقدہ لاینحل بنی ہوئی ہے۔ دانایان فرنگ نے مدتیں ہوئیں اپنے ہاں اس مسئلہ کو حل کر لیا اور اپنے ملک کی آب و ہوا اور ضروریات کے موافق ایک وضع ٹوپی کی قائم کر لی۔ اُس دن سے سارا یورپ ٹوپی پوش ہے۔ اگر تھوڑی سی تبدیلی مختلف ممالک کی

ٹوپیوں کی وضع میں ہے تو وہ جزوی اصول سب کا یہ ایک ہے اس کا کام سر کو سردی سے بچانا اور آنکھوں کے سامنے سایہ رکھنا اور ان کو آفتاب کی شعاعوں سے بچانا ہے۔ گویا ٹوپی بھی حکمت ہے۔ معلوم نہیں یہ حکمت اس ٹوپی کی جبلی ہے یا حکیموں کے سروں پر رہتے رہتے اس میں سرایت کر گئی ہے مگر اس میں شک نہیں کہ اہل فرنگ کی ٹوپی ہے اور گو باعتبار صورت ظاہری وہ حُسن کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ مگر حُسن باطن سے خوب آراستہ ہے۔ ترکوں نے بھی جو یورپ میں آباد ہیں۔ ٹوپی کے مسئلے سے عرصہ ہوُا فراغت پالی ہے اُنہوں نے ایک رنگ اختیار کیا ہے۔ جو ساری قوم میں مقبول ہے۔ وضع قطع تراش خراش میں ترکی ٹوپی جسے فیز یا طربوش بھی کہتے ہیں۔ ٹوپیوں میں ایسی ہی ممتاز ہے جیسے ترک باعتبار جسم اور قویٰ کے اِنسانوں میں اس کا موزوں سُرخ یا سیاہی مائل رنگ۔ اِس کی نرم نرم بانات۔ اِس کی لچک اِس کی سہولت۔ اور سب سے بڑھ کر اس کا لٹکتا ہوُا پھُندنا۔ دل فریب ہیں اور ترکوں کے سُرخ و سپید چہرے پر تو یہ وہ بہار دیتی ہے۔ کہ العظمت للہ مگر باعتبار فوائد کے یہ جہاں اِیجاد ہوئی ہے وہاں کے لئے موزوں ہو تو ہو۔ مگر ایسے ملک کے لئے جس میں انتہا درجہ کی گرمی یا انتہا درجے کی سردی پڑتی ہو۔ یا باری باری دونوں موسم آتے ہوں یہ ناقص ہے۔ ایرانیوں کے ہاں بھی اپنا قومی شعار موجود ہے اور ایک خاص انداز ٹوپی کا رائج ہے۔ مگر واہ رے ہندوستان۔ اونٹ کی طرح کوئی کل بھی تو سیدھی نہیں۔ اہل ملک کو نہ سر کا ہوش نہ پاؤں کی خبر۔ بنگالی ہیں کہ ننگے سر پھرتے ہیں اور مدراسی ہیں کہ ننگے پاؤں بنگالی اگر ٹوپی پہننے کا تکلف فرمائیں گے بھی تو برائے نام۔ وہاں سے چلئے صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کو لیجئے گرمی ہو یا سردی تمام پُرانے لوگ ایک چھ ماشے کی ٹوپی پہنیں گے جو ہوا سے اُڑ جائے۔ کوئی خاص تقریب ہوئی۔ یا میلا ٹھیلا ہوا تو لیس دار اوڑھنے لگے۔ اِس سے ترقّی کی تو سلمے ستارے کی نوبت

آئی۔ اب یہاں سے تفرقہ شروع ہوا۔ نئی پود کا اور لباس اور پرانی کا اور۔ پھر ایک تفریق ثانی۔ ہندوؤں کی اور ٹوپی مسلمانوں کی اور پھر آگے مسلمانوں میں اور تفریق۔ ٹوپی وہ نیرنگی دکھاتی ہے۔ کہ اگر کسی بڑے مجمع یا میلے یا تماشے میں لوگوں کی تصویر لی جائے اور ٹوپیوں کے جتنے نمونے وہاں موجود ہوں اُن کو جمع کیا جائے تو سینٹ لوئس کی آیندہ نمایش کے لئے ایک خاصہ محکمہ ٹوپیوں کا قائم ہو سکتا ہے۔ ہندوستان جیسے ملک میں یہ توقع رکھنا کہ یہ نازک مسئلہ کبھی پوری طرح سے حل ہوگا اور سارے اہل ہندوستان کے لباس میں یکرنگی آجائے گی۔ محال کی توقع رکھنا ہے۔ گو اس میں شک نہیں کہ ایسی یکرنگی قومیت کے لئے ضروری ہے۔ مگر کم از کم یہ تو ہو کہ ہندوؤں میں سب ایک ٹوپی پر اور مسلمانوں میں سب ایک ٹوپی پر رفتہ رفتہ متفق ہو جائیں۔ مسلمانوں میں ترکی ٹوپی پھیلتی جاتی ہے۔ اور مقابلہ اور نمونوں کے حق بھی رکھتی ہے کہ پھیلے مگر ابھی وہ وقت دور ہے۔ کہ یہ عملی طور پر سب کے سر پر نظر آئے۔ آپ اگر اس کی مشکلات سے آگاہ نہیں۔ تو لیجیئے سنیئے۔ بہت لوگ اس کے دشمن ہیں۔ بعض نازک دماغ ہیں جنہیں اس ٹوپی سے نیچریت کی بو آتی ہے۔ بظاہر ٹوپی ایک بے زبان بیگناہ چیز ہے۔ مگر ہمارے ملک میں آکر اسے خاص اثرات حاصل ہو گئے ہیں۔ یہ انسان کے دل کو بدل سکتی ہے۔ عقائد میں خلل ڈال سکتی ہے اسے پہنا اور نیچری ہونے کا تمغہ حاصل کیا۔ ایک حصّہ حکام کا ایسا ہے جو اس ٹوپی کو بیوفا سمجھتا ہے اور کہتا ہے اس کی ظاہری سیدھی سادی صورت پہ نہ جاؤ۔ اس میں بڑی بڑی شرارتیں پنہاں ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ جس نے ترکی ٹوپی پہن لی وہ فوراً ترک ہی بن گیا۔ اور ترکوں سے اور اہل فرنگ سے چشمک کچھ آج کی نہیں۔ مگر باایں ہمہ یہ چپکے چپکے دلوں میں گھر کرتی جاتی ہے۔ اور بھلا کئی اشخاص اس کے روز افزوں استعمال کو گھبراہٹ سے دیکھتے ہیں۔ وہیں بہت سی نگاہیں ترکی ٹوپی کی طرف اُمیدوں کے ساتھ اُٹھتی ہیں۔ کہ یہ کچھ کر کے دکھائیگی

ترکی ٹوپی میں صرف ایک عجیب بات ہے۔ ذرا مسجد میں کم جاتی ہے۔ اور اگر جائے تو دوسری ٹوپیاں اور عمامے اِسے کم نگاہی سے دیکھتے ہیں۔ لیکن اِس کی کامیابی اسی میں ہے کہ یہ ہر مقام کی سیر کرے۔ یہی نہیں کہ صرف بڑے بڑے انگریزی طرز کے جلسوں کے سٹیج پر ہی اپنے پہننے کی نمائش میں مصروف رہے یا صرف سینہ تان کے بیٹھنے والوں کے مجمع کی زیب ہو۔ بلکہ خانہائے خدا میں بھی پہنچے۔ جن میں داخل ہونیوالوں کے سر نیاز زمین پر دھرے رہتے ہیں۔

ہم ہی میں بعض لوگ ہیں جو انگریزی ٹوپی کے حُسن باطنی اور فوائد پر مٹے ہوئے ہیں۔ اس بات کی داد دینی پڑتی ہے کہ وہ صورت پرستی کے رہ گذر عام سے نکل کر سیرت پرستی کی منزلِ خاص تک پہنچتے ہیں۔ مگر سب یکساں نہیں بعض صرف اِسی لئے وہ ٹوپی پہننا چاہتے ہیں۔ کہ وہ صاحب لوگوں میں شمار ہوں۔ یہ صورت پرستی کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے اور قابلِ حقارت ہیں نے دیکھا کہ ایسے صاحبوں کی بھاری بھرکم ہیٹ پر وہ ہماری پُرانی ہو قیانوسی چھ ماشے کی ٹوپی بھی ہنستی ہے۔ اِسی طرح میں اُن شخصوں سے بمشکل متفق ہوسکتا ہوں جو انگریزی ٹوپی کو سفر میں پروانۂ راہداری بناتے ہیں۔ ان کی انگریزی ٹوپی گویا زمانہ ساز ٹوپی ہے۔ میں نے اکثر اپنے ہموطنوں سے جنہیں اس ملک میں سیاحت کا اتفاق ہوا ہے سُنا ہے کہ آدمی اوّل یا دوم درجہ کی گاڑی میں سفر کرنے کے مصارف برداشت کر کے بھی آرام نہیں پا سکتا تاوقتیکہ لباس سے کم از کم کرسٹان نہ معلوم ہو۔ اور اس لئے وہ بلا تأمل سفر کو روانہ ہوتے وقت انگریزی ٹوپی سر پر رکھ لیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ انہیں اس صورت میں ریل کے ملازموں سے کام لینے میں قدرے سہولت ہوتی ہے۔ اور اگر کوئی صاحب لوگ ہم سفر ہوں تو اُن سے بھی جھگڑے کا خطرہ کم ہوتا ہے۔ مگر اس آسائش کی اُمید پر وہ انگریزی ٹوپی کی عزت بڑھاتے اور اپنی ذاتی اور قومی عزت گھٹاتے

ہیں۔ گویا اس کے یہ معنے ہیں کہ اُن کے وہ معزز بھائی جو اپنے ملک کا لباس پہنتے ہیں۔ اور جو اُس کے ساتھ اگر چاہیں بھی تو انگریزی ٹوپی بغیر مضحکہ اُڑوانے کے نہیں پہن سکتے۔ ہمیشہ ریل کے سفر میں بے پروائی کی نظر سے دیکھے جائیں اور وہ صرف اپنی فوری ضرورت کے وقت کو ٹال لیں۔ وہ عزّت کیا ہے۔ جو آپ کو اس لئے ملے کہ دوسرا شخص آپ کو وہ نہیں سمجھتا جو آپ فی الحقیقت ہیں۔ بلکہ کسی اور کے دھوکے میں آپ کی عزّت کرتا ہے۔ عزّت وہ ہے جو آپ کی اپنی مستقل ٹوپی کی ہو۔ نہ کہ مانگی ہوئی عارضی ٹوپی کی۔ ہماری سعی یہ ہونی چاہیئے کہ ہم متفقہ طور پر ایک ٹوپی پسند کریں۔ اور اُسے اپنا ملکی اور قومی شعار بنائیں جس سے جہاں چاہیں پہچانے جا سکیں اور پھر اس کوشش میں ہمہ تن مصروف ہوں کہ وہ ٹوپی اتنی قابلِ عزّت و وقعت ہو جائے کہ جو اُسے دیکھے پکار اُٹھے کہ یہ ایک معزز قوم کا فرد آ رہا ہے۔ ٹوپی مشرقی ممالک میں ایک نشانِ عزّت ہے۔ اِسے پوری طرح معزز بنانا چاہیئے۔

محمدؐ اکرام

گالیاں

اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ گالیاں بھی انسان کے کلام میں ایک جزو ہیں بہت کم لوگ ہیں جو اُن سے بالکل پرہیز کرتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی گالی ہر شخص کی زبان پر غصّہ کے وقت آجاتی ہے بعض نہایت شریف اور متقی لوگ جو عام طور پر گالی کو بہت بُرا سمجھتے ہیں کسی وقت غصّہ کے مارے بیتاب ہو کر کسی کی شان میں تبرّے بازی کرتے ہیں مگر صرف اسی حالت میں کہ انہیں زبان پر قابو نہیں رہتا۔ وجہ یہ ہے کہ گالی دینے کی عادت اُس وقت پڑ جاتی ہے کہ جب انسان نیک و بد میں تمیز نہیں کر سکتا اور نہ اپنی عزّت و وقار کا چنداں خیال ہوتا ہے۔

سب لوگ ایک قسم کی گالیاں نہیں دیتے رذیل بازاری لوگ جو فحش اور غلیظ گالیاں بکتے ہیں۔ شریف وہ الفاظ کبھی نہیں منہ سے نکال سکتے۔ ہاں ہر سوسائٹی میں بعض لوگ ایسے ضرور ملیں گے جو مہذب اور تعلیم یافتہ طبقہ میں میل ملاپ رکھتے ہیں اور خود بھی معزز ہوتے ہیں مگر جب وہ گھر میں آتے یا ایسے لوگوں میں جاتے ہیں جن سے اُن کی نہایت بے تکلفی ہو یا جو اُن سے ادنیٰ ہوں تو وہ ایسے ایسے کلمات کہہ ڈالتے ہیں کہ اِن کی نسبت اُن کے مہذب دوست کبھی ایسا گمان نہیں کر سکتے۔ مگر عادت ایک ایسی چیز ہے کہ انسان پر کبھی نہ کبھی غلبہ پالیتی ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ شائستہ سوسائٹی میں کسی وقت اُن کے مُنہ سے ایسا لفظ نکل جاتا ہے کہ اُن کو شرمندہ ہونا پڑتا ہے میں نے ایکدفعہ دیکھا کہ ایک بہت بڑے تعلیمی جلسہ میں جہاں ملک کے برگزیدہ لوگ جمع تھے اور ایک صاحب کسی خاص مضمون پر نہایت جوش کے ساتھ تقریر

کر رہے تھے اُن کے مُنہ سے بے تکلّف ایک نہایت غیر مہذب لفظ نکل گیا۔ جو معلوم ہوتا ہے کہ معمولی بول چال میں اُن کا تکیہ کلام تھا۔ چنانچہ تمام لوگ باوجود آداب محفل کے بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنس پڑے جو ندامت اس وقت ان بزرگ کو ہوئی ہوگی وہ ظاہر ہے۔

مگر پیشتر اِس کے کہ گالیوں کے اخلاقی پہلو کو لیں۔ ہمیں دیکھنا چاہیئے۔ کہ اِن کا ماخذ کیا ہے۔ انسان کے تمام افعال کسی نہ کسی علّت سے خالی نہیں ہوتے اور ہر ایک رسم و عادت کی کوئی ابتدا ہوتی ہے اور کوئی خاص ضرورت اس کا موجب ہوتی ہے۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ جُوں جُوں انسان کے باہمی تعلقات بڑھے اور تمدن نے ترقی کی۔ اِسی قدر زبان ساتھ ساتھ بڑھتی گئی اس لئے کہ اِنسان کے تعلقات کا سب سے بڑا آلہ زبان ہی ہے پھر تعلقات کے بڑھنے سے محبّت اور نفرت بھی بڑھنے لگی۔ اَب یہ بات لازمی تھی کہ محبّت اور نفرت کا اثر زبان پر پڑے پس محبّت نے وہ تمام الفاظ پیدا کئے جو دعاؤں میں تہنیتوں میں تعریفوں میں کہے جاتے ہیں اور نفرت نے تمام گالیاں۔ بددعائیں اور نفرین۔ و مذمت کے کلمات کو ایجاد کیا اور پھر مختلف حالات زمانوں۔ مختلف طبیعتوں اور موقعوں نے اُن میں اس قدر گونا گونی اور کثرت پیدا کر دی کہ آج اگر کُل دنیا کی صرف گالیوں کی ایک لغت بنائی جائے تو اُمید ہے کہ نہایت ضخیم کتاب بن جائے۔

گالیوں کا امتحان کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کئی قسم کی ہوتی ہیں بعض دھمکیاں ہوتی ہیں جو ایک انسان کے دوسرے پر غالب ہونے کا اظہار کرتی ہیں۔ بعض بددُعائیں جو بولنے والے کی اپنی عاجزی ظاہر کرتی ہیں مگر اُس کے دِل کی خواہش کو بتاتی ہیں کہ اگر اُس کے اختیار میں ہو یا خدائی طاقت اُس کے پاس ہو تو وہ اِس طرح خلق کو نقصان پہنچائے۔ انسان پر بعض اوقات ان کا بڑا اثر ہوتا ہے اور دُکھے ہوئے دل کی بددعا نہایت خوفناک سمجھی جاتی ہے۔ شعرا

نے اس خیال کو کئی طرح سے ظاہر کیا۔

منجنیق آہِ مظلومان بہ صبح — سخت گیرد ظالماں را در حصار

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن — اجابت از درِ حق بہر استقبال مے آید

بعض صرف دوسرے کی مذمت ظاہر کرتی ہیں اور بولنے والا دوسرے شخص کی نسبت بُری رائے کا اظہار کرتا ہے۔

گالیوں کی نسبت یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ اگر مختلف قسم کی گالیوں کے الفاظ کے موضوع کی بابت سوچا جائے تو پتہ لگتا ہے کہ وہ انسان کی مختلف حالتوں پر اثر ڈالتی ہیں۔ اور جو چیز سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے اُس کی گالی سب سے زیادہ صدمہ پہنچانے والی ہوتی ہے اور دل کو کڑوی لگتی ہے مثلاً مستورات کے حیا کا پاس ہر شخص کو بدرجہ غایت ہوتا ہے اور انسانی غیرت کا بھی تقاضا ہے۔ اس لئے سب سے غلیظ گالیاں وہ ہیں جو اس غیرت پر حملہ کرتی ہیں۔ اور ایک شریف آدمی کے لئے کوئی بات اِس سے زیادہ دل دکھانے والی نہیں ہو سکتی جس قدر کوئی ایسی گالی جو اس کے گھر کے پردہ عصمت کو ہدف بنائے

بعض گالیاں ایسی ہیں جن میں خراب پیشوں اور بےحیائی اور بے عزتی کی عادتوں سے نسبت دی جاتی ہے۔

ان سے اُتر کر وہ گالیاں ہیں جن میں انسان کو ناپاک اور ادنیٰ حیوانوں سے تشبیہ دی جاتی ہے اور نسبتاً بھلے مانس لوگ عموماً ایسی ہی گالیاں طیش کے وقت بچوں یا نوکروں چاکروں کی تنبیہ کے لئے بولتے ہیں۔ بد دعاؤں میں یا تو مخاطب کی اپنی یا اُس کے عزیزوں کی مسرت چاہتے ہیں یا اُن کے لئے کوئی سخت بیماری یا مصیبت تجویز کی جاتی ہے۔

مگر سب قسم کی گالیوں میں ایک بات ظاہر ہے کہ شاید انسان کا کوئی فعل اس قدر بے سوچے سمجھے اور بے معنے نہیں ہوتا۔ ایک شخص دوسرے کو ہزار گالیاں دے ڈالتا ہے جن میں دھمکیاں بھی ہوتی ہیں۔ بد دعائیں بھی اور

ملامتیں بھی مگر سب سے نتیجہ صرف یہ نکلتا ہے کہ بولنے والا اُس سے خفا ہے اور اس وقت اُس کا غصہ مشتعل ہے بسا اوقات گالیاں دینے والا اُس شخص کا جسے گالیاں ملتی ہیں دنیا میں سب سے بڑا خیر خواہ ہوتا ہے اور اگر وہ شخص ایک لحظہ کے لئے سوچے کہ جو کچھ میرے مُنہ سے نکل رہا ہے میرا دل اُس کی کہاں تک تصدیق کرتا ہے تو وہ دیکھے گا کہ وہ ایک محض عبث فعل کر رہا ہے اور ہوا کو ناحق صدمات پہنچا رہا ہے۔ بارہا جسے صلواتیں سُنائی جاتی ہیں وہ موجود نہیں ہوتا بلکہ کوئی فرد بشر بھی پاس نہیں ہوتا مگر دل کا غصّہ ہے کہ آواز کی سینکڑوں شکلیں اختیار کر کے نکل رہا ہے اور کہنے والے کے اپنے کانوں کو ہی اُس کا مزا آرہا ہے۔

کون شخص ہے جس نے سڑک پر چلتے گاڑیبانوں اور چھکڑے والوں کو اپنے گھوڑوں یا بیلوں کا ہزار ہزار گالیاں دیتے نہیں سُنا۔ کبھی اُس حیوان کی ماں اور کبھی اُس کی بہن معرضِ عتاب میں آرہی ہے اور کبھی اُس کے پہلے مالک اور بیچنے والوں کی تواضع کی جارہی ہے بعض لوگ جب کسی کام میں مصروف ہوتے ہیں اور اُس میں کوئی مشکل پیش آجاتی ہے مثلاً کیل گاڑنے یا دھاگے کی گانٹھیں کھولنے یا برسات کے باعث سخت ہوئے ہوئے قفل یا کواڑ کھولنے میں دقت ہوتی ہے تو جب تک وہ کام نہ ہو جائے متواتر گالیاں دیئے جاتے ہیں۔

بعض دیوانے یا مخمور لوگ یوں ہی مغلظات بکتے ہیں جو اُن کے دیوانہ پن کے یا حالت نشہ کے کرشمے ہوتے ہیں اور نفس کی ناپاکی کو ظاہر کرتے ہیں۔

ہمارے ملک میں جُہلا جب خوشی میں آتے ہیں تو تفریحاً ایک دوسرے کو گالیاں دیا کرتے ہیں۔ ہولی کا تہوار جو یہاں ایک مشہور تہوار ہے اور موسم بہار میں آتا ہے اہل ہنود اس میں بہت خوشیاں مناتے ہیں اس میں ادنیٰ بازاری لوگ صرف دل لگی کے لئے ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہیں۔ بچوں

کو نئی سے نئی گالی سکھائی جاتی ہے جو دُکانوں پر بیٹھ کر ہمسایہ دُکان والوں کو جن سے بے تکلفی ہوتی ہے گالیاں دیتے ہیں اور اس زر قلب کا خوب دل کھول کر لین دین ہوتا ہے انہی دنوں میں بازاروں میں نوجوانوں کے بڑے گروہ ایک جگہ جمع ہو کر کسی خاص شخص پر آوازے کستے ہیں جو اپنے کوٹھے پر بیٹھا اُن کا جواب دیتا ہے ایک ایک گالی کو نہایت بلند آواز سے سو دفعہ دہرایا جاتا ہے اسی مشغلہ میں بعض اوقات ساری ساری رات گذر جاتی ہے جسے گالیاں دی جاتی ہیں وہ خاموش رہنا اپنی ہتک سمجھتا ہے اور ہر چند اُس کا گلا بیٹھ جاتا ہے اور اس کی آواز خستہ ہو جاتی ہے اور بے خوابی کی زحمت برداشت کرنی پڑتی ہے مگر وہ یہ بیعزتی ہر گز گوارا نہیں کر سکتا کہ اُس سے گالیوں کا جواب بن نہیں پڑا۔ یہی حال بعض عورتوں کا ہے جنہوں نے زبانی لڑائی کو بیکاری کا ایک مشغلہ قرار دے رکھا ہے۔ بعض بدزبان عورتوں نے خوش مزاجی میں اس بات کا اقرار کیا ہے کہ لڑائی میں اُنہیں ایک قسم کا مزہ آتا ہے اور جب کئی دن تک وہ کسی سے دو بدو نہیں ہوتیں تو خواہ مخواہ کوئی بہانہ پیدا کر لیتی ہیں بلکہ ایک خاص فرقہ کی عورتوں کی نسبت مشہور ہے کہ جب ان پر یہ ضدی جذبہ غالب آتا ہے تو وہ اپنی ہمسائی کو بلا کر لڑائی کی دعوت کرتی ہیں اور اس طرح ایک عظیم زبانی جنگ کی طرح ڈال دیتی ہیں۔ جو کئی کئی دن تک جاری رہتی ہے۔ نئی نئی اور فی البدیہہ گالیاں جو اُن کا حاضر جواب دماغ ایجاد کرتا ہے اُن کا دور دور کے گھروں میں چرچا ہوتا ہے اور ہمچشموں میں بہت تعریف ہوتی ہے۔

ہمارے ملک کی بعض اقوام میں بیاہ کے موقعہ پر جب دولھا والے برات لیکر آتے ہیں دلہن والے گھر کی عورتیں اپنے سمدھیوں کو اور برات والوں کو مقفیٰ گالیاں دیتی ہیں جنہیں سیٹھنیاں کہتی ہیں۔ اکثر فحش باتیں بے تکلفی سے کہی جاتی ہیں اور وہ عورتیں بھی جو عام طور پر بہت کم گو اور باحیا سمجھی جاتی ہیں اس رسم

میں شامل ہوتی ہیں گویا وہ خاص موقعہ اُنکو اس قبیح رسم کی اجازت دیدیتا ہے اور اُن کے مرد بھی اس سے اغماض کرتے ہیں بلکہ بعض خوش ہوتے ہیں۔

بے معنی گالیوں کے ذکر میں اُس مذموم عادت کا بیان کرنا شاید بیجا نہ ہوگا جو بدقسمتی سے ہندوستان کے لوگوں میں موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ چھوٹی لڑکیوں کو پیار کے موقعہ پر ایسے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے جو دراصل نہایت دل دکھانے والے ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ محض ایک عادت ہے، اور اُنکے کہنے والے اُن لڑکیونکو دل سے عزیز رکھتے ہیں ورجسوقت یہ الفاظ کہے جاتے ہیں باقی تمام حرکات نہایت ہی مہربانی اور نازبرداری کی ہوتی ہیں مگر یہ نتیجہ ہے۔ اہل ہندوستانکے اُس غلط اور خود غرضی کے خیال کا جس سے اُنھوں نے اپنے آپ کو اُناث سے اس قدر بلند پایہ اور اُن کا حاکم مطلق سمجھ رکھا ہے اور اُن پرطرح طرح کی غلامی کی قیدیں لگا رکھی ہیں۔

جو لوگ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوتے ہیں اور جو اصلاح نفس اور اصلاح ابنائے جنس کے خواہاں ہیں۔ انہیں گالیوں سے قطعی پرہیز کرنا چاہیئے زبان ہی انسان کی تہذیب کا پہلا معیار ہے اور گفتار کا اثر انسان کے افعال اور خلاق پر ہوتا ہے کبھی کوئی شخص مہذب نہیں بن سکتا جب تک اُس کی زبان مہذب نہ ہوگا لیاں بدتہذیبی کا نشان ہیں اور بے تہذیبی کی یادگار ہیں اور ہر ایک شخص کو کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ اِن سے احتراز کرے اور اپنی اولاد کو ایسے لوگونکی ہمنشینی سے بچائے جو دشنام دہی کے عادی ہیں گالیوں کی عادت نہ صرف انسان کو اخلاقی اور روحانی اصلاح سے باز رکھتی ہے بلکہ اچھی صحبت میں بیٹھنے کے ناقابل کر دیتی ہے اور خودداری اور غیرت کا مادہ دور کر دیتی ہے۔ اس لئے کہ جو دوسروں کو بُرا کہتا ہے وہ سُننا بھی ضروری ہے۔ (بقول شاعر)

دہن خویش بدشنام میالائے صائب
کیں زرِ قلب بہرکس کہ دہی باز دہد

عبدالرشید چشتی مرحوم

کیا رسم ستی بند ہو گئی ہے؟

در محبت چون زن ہندی کسے مردانہ نیست
سوختن بر شمع مُردہ کارِ ہر پروانہ نیست

ہندوستان کی درسی کتابوں میں اکثر زور کے ساتھ اُس زمانہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جب سایہ برطانیہ نے سرزمین ہند سے رسم ستی کی بیخکنی کر دی مُردہ خاوند کی لاش کے ساتھ بیوی کا جل مرنا قانوناً جرم قرار دے دیا۔ اور اس فعل کی امداد اور اعانت کو بھی جُرم ٹھہرایا۔ لیکن یہ معلوم نہیں کتنے لوگوں نے اس بات پر غور کیا ہے۔ کہ رسم ستی فی الحقیقت مسدود بھی ہو گئی یا نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جہاں تک ظاہری جل مرنے کا تعلق تھا وہ تو ترک کیا ہے۔ مگر ایک اور جل مرنا ہے جو ابھی جاری ہے اور جس کے انسداد کی کوئی صورت جلد بنتی نظر نہیں آتی۔ اور ہندوستان کی عورتوں کو اس جلا کر راکھ کر دینے والی آگ سے بچانیوالا کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ ستی بذاتِ خود ایسی بُری رسم نہ تھی کہ اُسے جرم کہا جا سکے۔ اُس کو معیوب اس بات نے بنا دیا۔ کہ عورتیں جلنے پر مجبور کی جانے لگیں۔ ورنہ باختیار خود جوش محبت کے اثر سے آگ میں کود پڑنا مجنونانہ حرکت ہو تو ہو مگر محض وحشیانہ حرکت نہ تھی۔ بلکہ انسانی طبیعت کے ایک زبردست جذبہ کا پُرزور ظہور تھا۔ ہندوستان کی بیشمار ستی ہونے والی بیواؤں میں کئی ایسی نیک نہاد اور پاک طینت عورتیں ہوں گی کہ اُن کی مردانگی کی یادگار میں بت بھی بنائے جائیں۔ شعر مندرجہ عنوان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایرانی شاعر کے دل پر ہندوستان کی اس رسم کا کیا اثر ہوا۔ اور اس نے جل مرنے کو ایسا فعل قرار دے کر جو رضا و رغبت

سے کیا گیا ہو۔ ستی کی کیسے خوب صورت الفاظ میں تعریف کی ہے۔ اور ہندوستان کی عورتوں کی محبت و مردانگی کی کیا بے ساختہ داد دی ہے اُس آگ میں اگر ستی فی صدی مجبوراً کودتی تھیں۔ تو یہاں نوّے فی صدی مجبوراً کڑھ کڑھ کر مرتی ہیں اُس میں جو بیں فی صدی سچے جوش سے اپنے آپ کو قربان کرتی تھیں۔ کم از کم اُن کی داد تو ملتی تھی۔ اُن کی قسمت پر ہمارے ایرانی شاعر جیسے آنسو بہانے والے تو پیدا ہو جاتے تھے۔ اور یہاں نہ کوئی خوشی سے بقیہ زندگی تلخ کر لینے والیوں کی داد دیتا ہے نہ مجبور جل بجھنے والیوں کے درد کو محسوس کرتا ہے۔ ہندوستان کے ہر گھر میں اور ہر گھر میں نہیں۔ تو ہر گلی ہیں۔ اور ہر گلی میں نہیں تو ہر محلے میں ایسا بھاڑ موجود ہے۔ جس میں کوئی باعصمت خاتون بیگناہ جل رہی ہے۔ مگر غضب یہ ہے۔ کہ دُھواں تک نہیں اُٹھتا اور اگر اُٹھتا ہے تو کوئی دیکھتا نہیں۔ اور اگر کوئی دیکھتا ہے تو آگ بجھاتا نہیں۔ وہ جلنا ایک آدھ گھنٹے کے لئے تھا۔ یہ جلنا ایک آدھ عمر کے لئے ہوتا ہے۔ اس جلنے پر کفِ افسوس ملتے تھے۔ اس جلنے کی کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ اُس جلنے کے بعد راکھ قدر و منزلت سے اُٹھا کر دریاے رواں کے صاف شفاف اور ٹھنڈے پانی میں بہا دیتے تھے اور اس راکھ کے ذرّوں کو پانی برسوں اپنی ٹھنڈک پہنچاتا تھا۔ یہاں راکھ ہونے کی نوبت آنے سے پہلے کچھ ایسے سامان ہوتے ہیں جو آگ پر تیل کا کام دیں۔ اور تیل بھی وہ تیل جو چپکے چپکے آتش کو تیز تو کر جائے۔ مگر بھڑکنے نہ دے۔ یہ سب امتیاز چھوڑ کر اُس ستی اور آج کل کی ستی میں بڑا فرق یہ ہے۔ کہ وہ قربانی خاوند کے مرنے کے بعد کرنی پڑتی تھی اور اس قربانی میں کئی ایسی نیک بخت عورتیں بھی ہیں جو خاوندوں کے جیتے جی چتا پر ہیں۔ شاعر نے فی الواقع بڑا عجیب نکتہ پیدا کیا ہے۔ اور نہایت نفیس پیرایہ میں زنانِ ہند کو قربانیٔ نفس کے بارہ میں دوسری عورتوں پر ترجیح دی ہے۔ مانا کہ عشق میں بڑی قوت ہے اور عورت خاوند کی

محبت میں یوں جان دیدے جیسے پروانہ شمع پر نثار ہوکر مرجاتا ہے۔ اور ایسی مثالیں ہر ملک میں نظر آئیں۔ مگر ایسا پروانہ اور کہاں ملتا ہے جو بجھی شمع کے گرد پھرے۔ اور بجھی شمع پر فدا ہو جائے یہاں بجھی شمع پر فدا ہونے والیاں آج بھی موجود ہیں ایک تو وہ جو خاوند کے مرنے سے حسب رواج ملک زندہ درگور ہیں۔ اِن کی حالت کی پُر درد کہانی چھیڑنے کے قابل نہیں۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اِن کو چھوڑ کر ذرا اُن کی حالت پر نظر ڈالیئے۔ جو خاوندوں کے جیتے جی اپنی مصیبت میں ہیں۔ کئی گھر ایسے ملیں گے جہاں خاوند کے دل میں محبت کی آگ یا تو جہاں تک بیوی کا تعلق ہے کبھی بھڑکی نہیں یا تھی۔ تو بجھ چکی ہے مگر بیوی کے دل کو ٹٹولو تو اُسی بجھے شعلے کے گرد چکر لگا رہا ہے جو الفت پہلے تھی وہ اب بھی ہے جو خدمت کا شوق اوّل میں تھا وہ آخر تک پایا جاتا ہے۔ جو ایثار آغاز میں تھا۔ وہی انجام تک ہے۔ جو وفا بچپن میں سیکھی تھی وہ ہاتھ سے نہیں گئی۔ اندر ہی اندر تن من جلا دیا۔ مگر ظلم پر اُف تک نہیں کی۔ یہ وہ ستی ہے جس میں زنِ ہندی آج تک ستی سے بڑھ کر مردانگی دکھا رہی ہے۔ گو آج اسکی بہادری کی قدر مفقود ہے۔ مگر یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اس صفت خاص میں دُنیا بھر کی عورتوں میں ہندی عورت اپنا جواب نہیں رکھتی۔

شیخ عبدالقادر

نفس کی قوتیں

زمانۂ حال کی تحقیقات ڈنکے کی چوٹ کہہ رہی ہے کہ نفس کی کیفیتیں بھی بجائے خود چیزیں ہیں۔ قوتیں ہیں اور جان بخش و جان کاہ قوتیں ہیں۔ جن سے بڑھ کر اس عالم اسباب میں اور کوئی قوت نہیں ہے۔

ہمارا ہر ایک خیال ایک معیّن شکل رکھتا ہے۔ ایک وجود رکھتا ہے جسے اُس کی جان کہنا چاہیئے اس میں ایک مخصوص طاقت اور قابلیت ہے۔ جس کی کیفیت اور کمیت اس شخص کی حالت طرز زندگی پر موقوف ہے جس کے دماغ میں اُس نے جنم لیا ہے۔

یہ سمجھنا کہ خیال کی ہستی نہیں۔ یہ بے قیام و بے ثبات ہے۔ نقش بر آب ہے۔ ہوا کا بلبلا ہے کہ خبر ہی نہیں کہاں اُٹھا اور کہاں بیٹھا۔ غلط ہے۔ اس کی ہستی پائدار ہے پیدا ہوتے ہی اُس کی صورت معیّن ہوتی ہے اُسی وقت اپنی طاقت اور قابلیت کو ساتھ لے کر نکلتا ہے۔ جو شخص ملتا ہے۔ جس کی زندگی سے ٹاکرا ہوتا ہے اُسی پر اپنا اپنا اثر ڈالتا ہے۔ اسی پر منتر مارتا ہے۔

علم النفس کے محقق تجربے اور مشاہدے کی رو سے آپ جانتے ہیں اور دوسروں پر ثابت کر رہے ہیں۔ کہ روح کا تعلق جسم کیا اور کتنا ہے اور وہ بدن پر کیسی حکومت کرتی ہے۔ اُنہوں نے معلوم کر لیا ہے کہ ہر ایک خیال ہر ایک جذبہ اپنا اپنا جدا خواص رکھتا ہے۔ اور انہی خواص کے موافق ہر اک کی تاثیر اور تحریک ہے۔ اس بنا پر خیالات اور جذبات کی فریق بندی بڑی صحت کے ساتھ کی گئی ہے۔ اوّل ہی اُن کے دو بڑے فریق ہیں ایک ادنٰے۔ ایک اعلٰے۔

فریق ادنٰے میں بغض۔ عداوت۔ حسد۔ کینہ۔ غضب۔ شہوت شامل ہیں۔ جب ان میں سے کوئی کیفیت غلبہ پاتی ہے بدن میں آگ لگ اُٹھتی ہے۔ ایک قسم کا زہر گھل جاتا ہے۔ گویا کسی نے تیزاب پلا دیا ہے۔ جو اندر ہی اندر بدن کو کھائے جاتا ہے۔ اور تمام اخلاط اور رطوبات کو زہر آلودہ کر کے دشمن جان بنا دیتا ہے۔ غصّے کی کیفیت کون نہیں جانتا۔ ایک لمحے کا غیظ و غضب سینے میں طوفان بپا کر دیتا ہے تمام اخلاط و رطوبات کو تلخ و ترش کر دیتا ہے اور ان ممدّات صحت کو مضرّات و سمیّات کے زمرے میں داخل کر دیتا ہے بھلا جب دو چار منٹ کے غصّے کا یہ حال ہے تو گھڑی دو گھڑی دو چار پہر۔ ایک دو روز کے غصّے کا تو خدا ہی حافظ ہے۔ متواتر غصّے سے کیونکر صحت میں فرق نہ آئے گا؟ اِس سے تو وہ مرض پیدا ہوں گے جن کی دوا لقمان کے ہاں بھی نہیں ملتی۔ اور ایک مرض کیا۔ اکثر مرض نفس کی حرکات قبیحہ اور جذبات رذیلہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ پہلے اندر ہی اندر طبیعت میں مرض گھر کر لیتا ہے۔ تب کہیں مادّی جسم میں اُس کا ظہور ہوتا ہے۔ زندگی کے سوتے اندر سے باہر کی طرف رواں ہوتے ہیں۔ جتنا دُکھ درد ہے باہر سے آ کر ہمارے اندر داخل ہوتا ہے۔ بلکہ اُس کی جڑ ہمارے نفس میں پھوٹتی ہے۔ زاں بعد اِس کے برگ و شاخ جسم میں نمودار ہوتے ہیں۔ خوف۔ حسد۔ بغض۔ کینہ۔ شہوت غضب سب بیماری کا گھر ہیں۔ ان میں سے ایک بھی تو ایسا نہیں کہ زہر کی خاصیت نہ رکھتا ہو۔ اور طرح طرح کے مخصوص مرض پیدا نہ کرتا ہو۔

فریق اعلٰے میں حلم۔ عفو۔ اُمیّد۔ محبّت۔ تواضع۔ تلطف۔ خوش مزاجی داخل ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کی بدولت بدن میں عمل صالح شروع ہوتے ہیں۔ جن سے ہاتھ پاؤں کھلتے ہیں۔ سینہ فراخی پاتا ہے۔ بصارت میں نور آتا ہے زبان میں امرت ہوتا ہے۔ طبیعت ہشّاش اور بشّاش رہتی ہے اُن کے نام

ہی کہے دیتے ہیں کہ یہ انسان کے اصلی اور ازلی یار و مددگار ہیں۔ قانون صحت کے یہی اصول ہیں۔ سلامتی کے بربط کے لئے یہی تار ہیں۔ خوش باشی اور خوش گذرانی کی معجون کے یہی اجزا ہیں۔ ہر ایک جزا کسیر کا حکم رکھتا ہے مجموعے کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ جس کے خون میں یہ اجزا سرایت کریں گے اُس کے بدن میں کون سی بیماری کا مادّہ ہوتا ہے؟ بالفرض کسی طرح کوئی مرض لاحق بھی ہو جائے۔ تو ان کے سامنے وہ کب کھڑا رہ سکتا ہے؟ یہ وہ نسخہ ہے کہ کایا پلٹ دے۔ حواس کو تازگی اور طاقت بخشے۔ دماغ آسمان سے باتیں کرے۔ ہر ایک رگ و ریشہ جملہ اقسام فساد سے پاک ہو۔ ایڑی سے چوٹی تک صحتِ کامل اور طاقت و اثر کا نمونہ بنے۔ اور خط و خال میں ایک نورانی جمال مثل فرشتوں کے نمودار ہو۔

جیارام

سوتاڑہ

بہارستانِ فطرت میں پہاڑوں کا ایک عجیب مرتبہ ہے کیسا ہی معمولی منظر ہو لیکن اگر وہ کسی اونچے پہاڑ پر منتہی ہوتا ہے تو اُس میں عجیب دلفوبی پیدا ہو جاتی ہے دُور سے سر سبز سر بفلک کشیدہ پہاڑ نظر آکر مردہ دلوں کو زندہ کرتے ہیں اور جو شفاف سیمیں چشمے اُن سے جا بجا اُچھلتے کودتے نکلتے ہیں وہ اپنی مجموعی قوت سے دریا بہاتے اور عالم کی سرسبزی و شادابی کا موجب ہوتے ہیں۔ یہی پہاڑ ہیں جن کا نظارہ انسان کو اپنی بے حقیقتی و بے بضاعتی کا دل ہی دل میں قائل کر کے کسی اور عالم میں پہنچا کر معرفت آلہی کا سبق پڑھاتا ہے اور انہیں پہاڑوں کی تاریک کھوؤں کی خوفناک تنہائی میں نفس امّارہ کا ستایا ہوا انسان گوشہ گزیں ہو کر عبادت و ریاضت کی بدولت قید جسمانی سے آزاد ہو کر کسی اور ہستی کی سیر کرتا ہے۔ یہی پہاڑ ہیں جو ہزار ہا سال سے بیش بہا جواہرات کو جگر گوشوں کی طرح سینہ میں چھپائے ہوئے چلے آتے ہیں اور سختی مقابلہ سے انسان کی ہنر بن کوششوں کی بھی بہ مشکل اُن تک رسائی ہونے دیتے ہیں۔ اُنہیں پہاڑوں کی چوٹیوں پر بکھرے ہوئے سنگریزے ایسے ایسے سمندروں اور دور دراز طوفانوں کو یاد دلاتے ہیں جن کے مقابلہ میں گویا طوفان نوح کل ہوا ہے۔ غرضیکہ پہاڑ زمانہ قدیم کی جہاں تک کے مورخوں کا ذہن بھی رسائی نہیں کر سکتا زندہ تاریخ اور انسان کے لئے عجب مایۂ دولت و عبرت ہیں۔

ضلع بیرڑ کی خوش قسمتی ہے کہ مغربی گھاٹ کا شمالی حصّہ آدھے ضلع کو گھیرے ہوئے ہے۔ اور گو ان پہاڑوں میں یہ بڑا نقص ہے کہ درختوں سے

جو درحصل ان کا زیور ہیں بالکل خالی ہیں اور اُن کا بالائی حصّہ کوسوں تک انسان وحیوان کی سکونت اور پرورش کے لئے پھیلتا ہوا چلا گیا ہے۔ اور صرف نظر کے قدم قدم پہ چھوٹے اور بڑے۔ گول اور نوکدار روڑوں سے ٹھوکر کھانے سے محسوس ہوتا ہے کہ بالائے کوہ ہیں۔ لیکن پھر بھی کہیں کہیں خصوصاً چڑھائو اور اُتار پر ایسے ایسے دلفریب سمے سامنے آجاتے ہیں جو بھُولے سے بھی نہیں بھولائے جا سکتے۔ اگرچہ گرمیوں کے موسم میں اُن کی جلی بُھنی سطح اور ڈراؤنی بلندی تھکے ماندوں مسافروں کا دل دور سے نظر آکر بیٹھا دیتی ہے لیکن کسی کسی مقام پر جب قریب پہنچے ہیں تو اُس کی کافی تلافی ہوجاتی ہے۔ بیڑ کے مغرب میں جس مقام پر گھاٹ ختم ہوتا ہے وہاں کی زمین عجب زرخیز ہے کوسوں تک جدھر نظر جاتی ہے ہرے بھرے کھیتوں کی تازگی کحل الجواہر کا کام کرتی ہے اور برسات کے موسم میں خواہ حضرت میکائیل کیسی ہی جزرسی فرمائیں مگر وہاں کی سیر حاصل زمین محنت کے مارے کسانوں کو دفت پر مالامال کر دیتی ہے جُوار کے درخت انسان کے قد سے بھی ایک ہاتھ اونچے ہوتے ہیں۔ اور بڑے بڑے دانوں کی کثرت سے بالیں جُھکی پڑتی ہیں اُن زرخیز کھیتوں کا سلسلہ ایک سیدھی ہموار سڑک پر ختم ہوتا ہے جو بخط مستقیم گھاٹ سے اُترتے ہوئے گجرات کو جاتی ہے یہ کھیت اور یہ سڑک آفتاب کی تیز روشنی میں بالکل ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ گویا دھانی دوپٹہ پر روپہلی ٹھپّہ لگا ہوا ہے اس سڑک کے دوسری طرف گھاٹ کے کنارہ کے نزدیک موضع سوناڑہ اس طرح واقعہ ہوا ہے کہ گویا کوئی عقاب قلّہ کوہ پر پر پھیلائے ہوئے بیٹھا ہے اگرچہ مکانات اور باشندوں کی عام حالت اور اشغال کے لحاظ سے مرہٹواری کے دوسرے دیہات کے مقابلہ میں سوناڑہ میں کوئی چیز مابہ الامتیاز نہیں ہے لیکن کوہ کے اطراف کی سرسبزی وشادابی ٹھنڈی ہوائیں باشندوں کی فارغ البالی اور تواضع اور سب سے زیادہ وہاں کا دلفریب منظر انسان کے

دل پر عجب اثر ڈالتا ہے۔ موضع کے دوسری طرف بجانب مغرب نصف میل تک اُفتادہ زمین کا سلسلہ جو کہیں سے اونچی اور کہیں سے نیچی ہے نشیب و فراز ہستی کا سبق پڑھاتا ہوا گھاٹ کے کنارہ تک چلا گیا ہے وہاں پہنچکر خدا کی قدرت کا تماشا نظر آتا ہے۔ اگر ذرا گردن جھکا کر دیکھا جائے تو ایک عمیق غار نظر آتا ہے جس کے دونوں طرف سیدھی دیواریں کھڑی ہوئی ہیں یہ دونوں دیواریں مل کر زاویہ حادّہ بناتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی فوق الانسان قوت نے پہاڑ کا ایک مثلث نما ٹکڑا جدا کر لیا ہے عمق پانچ چھ سو فیٹ سے کم نہیں ہے اور چونکہ اُتار بالکل عمودی ہے اس لئے نظر کا نپتی تھراتی نیچے اُترتی ہے مگر وہاں پہنچکر جو سماں سامنے آتا ہے وہ تمام خوف اور تمام زحمت کا کافی بلکہ کافی سے بھی زیادہ معاوضہ ہوتا ہے۔ چونکہ عرف عام میں اس غار کی گہرائی سونا ڑہ کے برابر سمجھی جاتی ہے اس لئے موضع کا نام سونا ڑہ رکھا گیا ہے خوف زدہ نگاہ سطح تحتانی پر پہنچکر ہر طرف گھنے درخت دیکھتی ہے جن کے گھنگور پتوں کی سیاہی مائل سبزی دل پر ایک خاص اثر پیدا کرتی ہے اور درختوں کے بیچ میں پتوں کی سبز نقاب منہ پر ڈالے ہوئے ناہموار پہاڑی سطح پر ایک بلوریں چشمہ بہتا ہوا نظر آتا ہے جہاں کہیں کہ پتے زیادہ گھنے نہیں ہیں یا درختوں کی شاخیں آپس میں گلے ملتی ہیں یا ہوا کے جھونکے نقاب کو ذرا چہرہ سے ہٹا دیتے ہیں چشمہ کے شفاف پانی کی نورانی جھلک انسان کی اپنی ہستی کو بھلا کر کسی اور ہستی کو یاد دلاتی ہے۔ غور سے دیکھتے ہیں تو پانی میں کسی گنبد نما عمارت کا عکس پیچ و تاب کھاتا ہوا نظر آتا ہے اور جب سایہ سے اصل کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے تو ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے گھنے پتوں کی گہری سبزی سے کوئی سفید سفید چیز جس نے منظر کو اور دلربا بنا دیا ہے جھانکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے جس مقام پر غار بصورت زاویہ ختم ہوتا ہے وہاں کچھ اور ہی کیفیت ہے ہر طرف سے چھوٹے چھوٹے چشمے

بہتے چلے آتے ہیں اور غار کے قریب پہنچکر اُن کا منتشر پانی ایک تیز پہاڑی چشمے کی شکل میں نمودار ہوتا ہے جو شور مچاتا اُچھلتا کودتا مچلتا کنارہ تک پہنچتا ہے۔ اور وہاں اپنی سطح کو جس کی تلاش میں اس قدر سرگردان و پریشان ہونا پڑا ہے نہ پاکر بے قرار ہو جاتا ہے اور اُسی کرب و اضطراب کے عالم میں ایک چھلانگ ایسی مارتا ہے کہ مُنہ کے بل گرتا ہے۔ یہ تماشا دیکھ کر انسان اس قدر محو ہو جاتا ہے کہ اس کا بے اختیار جی چاہتا ہے کہ ذرا نیچے اُتر کر اس بہار جانفزا کا لطف اور بھی اچھی طرح اُٹھائیں۔ مگر پہلے یہ عمودی اُتار دل بٹھا دینے والی گہرائی اور اونچی اونچی ناہموار سیڑھیاں اُس کے پاؤں پکڑ لیتی ہیں مگر شوق اسے اس زور سے دھکیلتا ہے کہ بے اختیار اُس کے قدم حرکت میں آتے ہیں اور اُن انگھڑ سیڑھیوں کو جن کے بنانے میں دست صنعت کا بہت ہی دخل ہے۔ جس طرح بنتا ہے طے کرتا ہوا ایک ایسے مقام پر پہنچتا ہے۔ جہاں کچھ دور پھسلوان چٹان کے سوا کوئی اور شے نظر نہیں آتی مجبور بیٹھ کر پھسلنے لگتا ہے اور جب تھوڑی دیر میں پھر سیڑھیاں نمودار ہو جاتی ہیں تو پھر پہلے کی طرح گرتا پڑتا آگے بڑھتا ہے اور خدا خدا کرکے کوئی آدھ گھنٹہ کی سخت محنت میں جو اُس کو پسینے پسینے کر دیتی ہے۔ نیچے کی سطح پر قدم رکھتا ہے۔ مگر وہاں پہنچتے ہی ایسا ہوش ربا سین دیکھتا ہے جو تمام کلفتوں کو آن کی آن میں بُھلا دیتا ہے دو طرف سے سر بفلک کشیدہ سنگلاخ دیواریں نظر کو روکتی ہیں۔ جن پر جابجا کسی دیہاتی مگر ہمدرد انسان نقاش نے اپنے غیر تربیت یافتہ ہاتھوں سے آدمی تماپتلوں کی اَنگھڑ تصویریں ناواقف اُترنے والوں کی رہبری کے لئے بنا دی ہیں جنوب کی طرف جہاں تک نظر جاتی ہے کھیت ہی کھیت پھیلتے ہوئے چلے گئے ہیں۔ جن میں ایک شفاف ندی جس کا پاٹ فاصلہ کے ساتھ بڑھتا جاتا ہے بہہ رہی ہے۔ شمال کیطرف آبشار ریل کی طرح شور مچاتی ہوئی گر رہی ہے۔ مگر درختوں کے جھرمٹ کی

وجہ سے نظر نہیں آتی۔ بیچ میں ایک بلوریں چشمہ اپنی پہاڑی ندی میں عجب مستانہ چال سے لڑکھڑاتا قدم قدم پر گول اور نوکدار چوپہل چھوٹے اور بڑے سنگریزوں سے ٹکر کھاتا ہوا بہہ رہا ہے اور ہر طرف بڑے بڑے درخت اس کے سرد اور شفاف پانی کو آفتاب کی گرمی اور پہاڑی ہواؤں کے تند جھونکوں سے محفوظ رکھنے کے لئے ہر طرف چھتریاں لگائے کھڑے ہیں۔ جن میں سے چھن چھن کر آفتاب کی زرد کرنیں سطح آب پر گرتی اور پانی میں مہتاب کے چھوٹنے کا سماں دکھاتی ہیں۔ چشمہ کے اُدھر پتّوں میں چھپی ہوئی وہی عمارت جس کا عکس اوپر سے نظر آیا تھا دکھائی دیتی ہے اور جب چشمہ کو عبور کر کے دوسری طرف پہنچتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ بلند کرسی پر ایک چھوٹا سا مندر ہے۔ جو کسی فطرت پرست رشی نے اس ہوش ربا مقام میں جہاں ہر شے صانع حقیقی کی لاجواب صنعت کا پتہ دے رہی ہے۔ اطمینان قلب سے صحیفہ فطرت کی ورق گردانی میں مصروف رہ کر رازہستی کے حل کرنے کی نیت سے بنایا ہے اس دلربا مندر کی سیر اور اُس کے پانی کے لاجواب انتخاب پر داد دے کر انسان درختوں کے سایہ میں چشمے کے کنارے کنارے اس کی دل لبھانے والی خوش فعلیوں کا نظارہ کرتا ہوا شمال کی طرف بڑھتا ہے اور جونہی کہ درختوں کے جھنڈ سے سر نکالتا ہے۔ ایک عجیب جانفزا منظر نظر کے سامنے آ جاتا ہے۔ شور ایسا ہے کہ کان پڑی آواز نہیں سُنائی دیتی۔ مگر معلوم یہ ہوتا ہے کہ ایک دریا اُمڈا ہوا چلا آتا ہے جس سے نظر کو حیرت کے ساتھ تسکین بھی ہوتی ہے۔ جب عالم محویت میں قدم بڑھاتا۔ اور بھی قریب ہوتا اور نظر اُٹھا کر دیکھتا ہے تو پہلے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک بلّور کی چادر ہوا میں لٹکی ہوئی ہے مگر کسی قدر نیچے آ کر اُس چادر کے ٹکڑے ہو کر کئی دھاریں بن جاتی ہیں اور تھوڑی دور تک یہی کیفیت رہتی ہے پھر ہر چھوٹی دھار بڑی بڑی بوندوں کی شکل میں منتقل ہوتی ہے جن کی جسامت فاصلہ کے ساتھ

گھٹتی جاتی ہے یہاں تک کہ جب نیچے پہنچتی ہیں تو چھوٹی ہوتی ہوتی جزولاتجزی کا ثبوت دیتی ہوئی دھوئیں کی شکل میں نمودار ہوتی ہیں لیکن یہاں کی خاک بھی اکسیر کا حکم رکھتی ہے کہ یہ موہوم اجزائے مائی سطح تحتانی سے ملحق ہوتے ہی پھر ایک زوردار چشمہ بن جاتے ہیں۔ یہ نظارہ اس قدر دلفریب ہے کہ انسان گھنٹوں تک عالم محویت میں نظر جمائے کھڑا رہتا ہے پھر دفعتاً خیال آتا ہے کہ شام ہوئی جاتی ہے واپس چلنا چاہئے مگر شوق کے تقاضے اور ہمت دلانے نے یہاں تک تو پہنچا دیا تھا لیکن اَب واپسی کارے دارد بہر حال جس طرح بھی ممکن ہے بادلِ ناخواستہ گرتا پڑتا بیٹھتا اٹھتا جا بجا پانی سے حلق کو تر کرتا ہوا اوپر پہنچتا ہے اور تھک تھکا کر بدن تختہ سا ہو جاتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ع

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

محمد عزیز مرزا۔ بی۔ اے

طلسم خیال

پندرہ برس کی عمر میں مجھ کو اپنے وطن سے کوئی سو میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ اُس گاؤں میں پہنچکر اگلے دن صبح کے وقت میں ٹہلتا ٹہلتا جنگل میں چلا گیا۔ ستمبر کا مہینہ تھا مگر اُس صبح میں گرمی اور روشنی ماہ جولائی کی صبح کی سی تھی۔ جنگل میں شاہ بلوط کے درخت چند اخروٹ کے درختوں کے ساتھ ملے جلے کھڑے تھے اور میرے سر پر اُن کا نہایت گنجان سایہ تھا۔ زمین سخت اور ناہموار تھی اور اس پر جھاڑیاں اور چھوٹے چھوٹے کم سن درختوں کے جھنڈ چھائے ہوئے تھے اور صرف ڈنگروں کے رستے ہی ان جھاڑیوں میں جاتے تھے۔ جس راستے پر اتفاق سے میں گیا وہ ایک شفاف چشمے پر تھا۔ جس کے کنارے پر ہری ہری گھاس کا حاشیہ تھا۔ اس گھاس میں صبح بہار کی سی شاداب سبزی تھی چشمے پر شاہ بلوط کے ایک بڑے تناور درخت کے تنے کا سایہ تھا۔ سورج کی ایک کرن اکیلی نیچے آئی اور پانی میں سنہری مچھلی کی طرح کھیلنے لگی۔

بچپن ہی سے مجھے چشموں کے دیکھنے کا بڑا شوق رہا ہے۔ یہ پانی ایک گول ظرف میں کھڑا تھا۔ یہ ظرف چھوٹا سا تھا مگر گہرا۔ اس کے اندر پتھر جمے ہوئے تھے۔ بعض پتھر ہری ہری کائی سے ملبوس تھے بعض بالکل برہنہ مگر طرح طرح کے رنگوں کے۔ سرخی مائل۔ سفید اور بھورے تہ پر موٹا موٹا ریت تھا جو اُس اکیلی کرن کی روشنی میں چمکتا تھا اور چشمے کو غیر مستعار روشنی سے منوّر کرتا تھا۔ ایک جگہ پانی کا اُمنڈنا ریت کو سخت تر حرکت میں لاتا تھا لیکن اسطرح

کہ چشمہ تاریک نہ ہوتا تھا اور نہ اُس کی سطح کی آئینہ وار صفائی میں فرق آتا تھا۔ مجھے ایسا خیال ہوا کہ گویا کوئی زندہ مخلوق جو شاید اس چشمے کی پری ہو ایک حسین نوجوان نازنین کے روپ میں پانی کی کائی کا باریک لباس پہنے ہوئے قوس قزح کے قطروں کی پٹی لگائے ہوئے۔ اپنا بے مہر معصوم۔ اور بے جذبہ چہرہ دکھاتی ہوئی نکلنے کو ہے۔ اگر وہ ان پتھروں میں سے ایک پر بیٹھی ہوئی اپنے گورے گورے پاؤں ننھی ننھی لہروں میں مارتی ہوئی اور پانی کو اُچھال کر دھوپ میں چمکاتی نظر آئے۔ تو دیکھنے والا مسرت اور خوف سے کس قدر کانپے۔ جہاں کہیں وہ سبزے یا پھولوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیگی۔ وہ فوراً شاداب ہو جائیں گے۔ گویا اُن پر صبح کی شبنم پڑ گئی۔ پھر وہ ایک چتر گرہستن کے مانند کام میں مصروف ہو کر مرجھائے ہوئے پتے کائی دار لکڑی کے ٹکڑے پرانے شاہ بلوط کے پھل اور اناج کے دانے جو ڈنگروں کے مُنہ سے پانی پیتے پیتے گر گئے ہیں۔ چشمے سے نکال ڈالے گی۔ حتیٰ کہ چمکتا ہوا ریت روشن پانی میں ہیروں کے خزانے کے مانند دکھائی دینے لگے گا۔ لیکن اگر تماشائی بہت ہی قریب آ جائے گا۔ تو اُس کو صرف موسم گرما کے مینہ کے قطرات ہی اُس جگہ پڑے چمکتے ملیں گے۔ جہاں اُس نے اُس نازنین کو دیکھا تھا۔

جہاں اس شبنمی پری کو ہونا چاہیئے تھا۔ وہاں سبزے کے حاشیئے پر لیٹ کر میں آگے کو جھکا۔ اور پانی کے آئینے میں دو آنکھیں میری آنکھوں سے دوچار ہوئیں۔ یہ میری آنکھوں کا عکس تھا۔ میں نے پھر جو جھانکا۔ تو ایک اور چہرہ نظر آیا۔ یہ میرے اپنے عکس سے پرے کو چشمے کی گہرائی میں تھا۔ سارا چہرہ صاف نظر آتا تھا۔ تاہم خیال کی مانند دھندلا تھا۔ اس نظارہ کی شکل ایک سنہری گیسوؤں والی حسین نوجوان لڑکی کی سی تھی۔ اُس کی نگاہوں میں مسرت آمیز تبسم کی جھلک تھی۔ اور تمام دھندلے چہرے پر اس تبسم سے گڑھے پڑ جاتے

تھے یہاں تک کہ یہ خیال ہوتا تھا کہ اگر یہ چشمہ دھوپ میں فرطِ انبساط سے رقص کرنے لگے۔ اور رقص کرتے کرتے ایک عورت کی شکل اختیار کر لے۔ تو بالکل ایسی ہو۔ رُخساروں کی نفیس اور دھندلی گلابی رنگت میں سے بھورے بھورے پتے۔ کائی دار شاخیں۔ شاہ بلوط کے پھل اور چمکیلا ریت جھلک رہا تھا۔ وہ اکیلی کرن سُنہری بالوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ اور پگھل کر بالوں کی چمک بن جاتی تھی۔ اور اُس خوبصورت سر کے گرد ایک ہالۂ عظمت ڈالتی تھی۔

میں بیان نہیں کر سکتا تھا۔ کہ کیسے یکایک یہ چشمہ آباد ہو گیا۔ اور کس قدر جلد ویران ہو گیا۔ میں نے ایک سانس لیا۔ تو وہ چہرہ موجود پایا۔ میں نے سانس روکا۔ اور وہ چہرہ چل دیا۔ "ہیں۔ ایہ غائب ہو گیا یا معدوم ہو گیا؟" مجھے یہاں تک شک ہو گیا۔ کہ وہ چہرہ کبھی تھا بھی یا نہیں۔

پیارے ناظرین! جہاں یہ نظارہ مجھے دکھائی دیا۔ اور مجھ سے چھُپ گیا۔ وہاں میں نے کیا مزے سے خواب کے سے عالم میں ایک گھنٹہ صرف کیا۔ دیر تک بالکل بے حرکت اسی انتظار میں بیٹھا رہا۔ کہ وہ صورت دوبارہ نظر آئے اور ڈر رہا تھا۔ کہ مبادا ذرا سی حرکت یا میرے سانس کی جنبش اُس صورت کو آتے آتے ڈرا کر بھگا دے۔ اسی طرح میں اکثر کوئی دل کش خواب دیکھتا دیکھتا چونک اُٹھا ہوں۔ اور پھر اس اُمید پر خاموش رہا ہوں۔ کہ شاید وہ خواب پھر نظر آ جائے۔ میں اس ہوائی وجود کی نوعیت اور صفات کے بارے میں بہت غور و خوض کرنے لگا کہ "کیا میں ہی اسے عدم سے وجود میں لایا تھا؟ کیا یہ میرے خیال کی صورت تھی۔ اور اُن عجیب و غریب شکلوں کی قسم سے تھی۔ جو بچوں کی آنکھوں کے پپوٹوں کے اندر آ کر جھانکنے لگتی ہیں؟ کیا اس کا حسن مجھے لمحہ بھر خوش کر کے فنا ہو گیا؟ کیا یہ اس چشمے کے اندر کوئی پانی میں رہنے والی پری تھی۔ یا جنگل کی دیوی تھی۔ جو میرے کاندھے پر سے میرے پیچھے کھڑی جھانک رہی یا کسی ایسی دوشیزہ کا ہمزاد تھا۔ جس سے کسی نے بے وفائی کی تھی۔ اور وہ

عشق کے ہاتھوں جان پر کھیل گئی اور ڈوب کر مر گئی ؟ یا حقیقت ہی میں ایک پیاری لڑکی گرمجوش دل والی اور ایسے ہونٹوں والی جن کا چومنا احاطۂ امکان سے خارج نہیں ہے چپکے سے دبے پاؤں میرے پیچھے آکھڑی ہوئی تھی اور اپنا عکس چشمے میں ڈال رہی تھی ؟"

میں اسی انتظار میں بیٹھا دیکھتا رہا۔ لیکن پھر نظارہ دکھائی نہ دیا۔ میں اُٹھ کے چلا آیا۔ مگر مجھ پر کچھ ایسا جادو سا ہو گیا تھا۔ کہ اُسی روز سہ پہر کو میں اس چشمہ پر پھر گیا۔ وہی پانی اُمنڈ رہا تھا۔ وہی ریت چمک رہا تھا اور وہی سورج کی کرن ٹمٹما رہی تھی۔ ہاں وہ نظارۂ نہ تھا۔ وہاں اِس عزلت آباد کا راہب ایک بڑا سا مینڈک موجود تھا۔ اور اُس نے فوراً اپنی داغدار تھوتھنی کو ہٹا لیا۔ اور سوائے اپنی لمبی ٹانگوں کے سارے کا سارا ایک پتھر کے نیچے غائب ہو گیا مجھے وُہ شیطان کی صورت دکھائی دیتا تھا۔ اور میں اُسے یہ سمجھ کر مار بھی ڈالتا کہ کوئی جادوگر ہے۔ جو اس عجیب و غریب نازنین کو اُس چشمے میں قید کئے ہوئے ہے۔

افسوس اور غم کے عالم میں میں گاؤں کو واپس آرہا تھا۔ میرے اور گرجا کے مینار کے درمیان ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی۔ پہاڑی کی چوٹی پر درختوں کا ایک جھنڈ باقی تمام جنگل سے علیحدہ تھا۔ مغرب کی طرف سے کچھ روشنی ان درختوں پر بھی منڈلا رہی تھی۔ اور مشرق کی طرف ان کا سایہ بھی اکیلا ہی پڑتا تھا چونکہ دن بہت ڈھل گیا تھا۔ دھوپ پر اُداسی سی چھائی ہوئی تھی اور سایہ کے چہرے پر بشاشت تھی عظمت اور تاریکی اس دھیمی روشنی میں ملی جلی تھی گویا کہ دن اور شام کے ہمزاد اُن درختوں کے نیچے دوستوں کی طرح آملے اور ایک دوسرے کو اپنا ہم جنس پایا۔ میں نگاہِ تحسین سے اس نقشہ کو دیکھ ہی رہا تھا۔ کہ شاہ بلوط کے درختوں کے جھنڈ کے پیچھے سے ایک نوجوان لڑکی کی شکل دکھائی دی۔ میرا دل اِس کو پہچان گیا۔ یہ وہی نظارہ تھا۔ لیکن وہ

اس قدر دُور اور ہوائی۔ اُس دُنیا سے اِس قدر نرالی اور جس جگہ وہ کھڑی تھی اُس جگہ اُداس عظمت سے اس قدر بہرہ ور معلوم ہوتی تھی۔ کہ میرا دِل پہلے سے بھی زیادہ اُداس ہو کر بُجھ گیا۔ یہی خیال آیا۔ کہ اُس تک کیونکہ میری رسائی ہو سکتی ہے؟

میری نظر اُدھر محوِ تماشا تھی۔ کہ یکایک اُن درختوں کے پتوں پر پڑ پڑ بارش ہونے لگی۔ ایک دم میں ہوا روشنی سے معمور ہو گئی۔ مینہ کی ہر ایک بُوند میں برستے ہوئے دھوپ کا کچھ حصّہ منعکس ہوا۔ اور یہ تمام باریک بارش دُھندسی معلوم ہونے لگی۔ بس میں صرف اسی قدر سکت تھی۔ کہ روشنی کے بوجھ کو برداشت کر سکے۔ ہوا میں قوس و قزح نمودار ہوئی۔ اس کا رنگ اِس قدر شوخ تھا۔ جیسا آبشار نیاگرا کی قوس قزح کا ہوتا ہے۔ اس کا جنوبی سرا ان درختوں کے آگے آکر زمین کو چھوتا تھا۔ اور اس نظارہ کو اس طرح اپنا لباس پہناتا تھا۔ کہ گویا آسمانی رنگ ہی اُس کے حسن کا شایاں لباس ہے۔ جب قوس قزح غائب ہوئی۔ تو وُہ نازنین بھی جو اس قوس قزح کا جزو معلوم ہونے لگی تھی۔ کافور ہو گئی۔ کیا اُس مہ جبین کی ہستی قدرت کے اس نہایت پیارے ظہور میں جذب ہو گئی۔ یا اُس کا نفیس جسم اِس رنگا رنگ روشنی میں پگھل گیا؟ مگر میں اُس کے پھر نظر آنے کی آس نہ توڑ دُوں گا۔ کیونکہ قوس قزح کا لباس پہن کر وہ اُمید کی تصویر بن گئی ہے۔

اِس طرح سے یہ نظارۂ چھوٹ گیا۔ اور اِس جدائی کے لمحے کے بعد بہت سے پُرانددہ دن آئے ہیں نے اس نازنین کو جب وُہ میری نظروں سے غائب ہو گئی چشمے کے پاس جنگل میں۔ پہاڑی پر۔ گانوں میں پُر شبنم صبح کو۔ تپتی ہوئی دوپہر کو اور غرُوب آفتاب کے جادُو بھرے وقت۔ غرض بہت ہی ڈھونڈا مگر کچھ پتہ نہ ملا ہفتے گذر گئے۔ مہینے گذر گئے۔ مگر وُہ دکھائی نہ دی میں نے اپنا بھید کسی کو نہ بتلایا۔ اِدھر اُدھر پھرتا تھا یا تنہا بیٹھا رہتا تھا گویا مجھے خلد بریں کی ایک جھلک دکھا دی گئی تھی۔ اور اب اس دنیا

میں دل نہیں لگتا۔

میں ایک اندرونی دنیا میں جا بسا۔ وہاں میرے خیالات کی بستی تھی۔ وہ نظارہ اُن خیالات کے ہمراہ رہتا تھا۔ میں خود بخود بلا ارادہ کئے ہی گویا ایک عشقیہ فسانے کا ہیرو بن گیا۔ رقیب بھی خیال ہی خیال میں پیدا ہو گئے۔ واقعات بھی ہونے لگے اپنے اور دُوسروں کے کارنامے بھی دکھائی دینے لگے اور عشق کے تمام تغیرات اور انقلابات کا مجھ کو تجربہ ہونے لگا۔ حتیٰ کہ رشک اور یاس کا انجام راحت ہُوا آہ! اگر مجھے اس وقت جوانی کی سی آتش خیز قوت متخیلہ اور کہولت کا بے جوش عطیہ یعنی قوتِ بیان دونو حاصل ہوں تو پیاری نازنینو! تمہارے دل میرے فسانے کو سُن کر تڑپ ہی تو اُٹھیں گے۔

ماہ جنوری کے وسط میں مجھ کو گھر سے بُلاوا آگیا۔ گھر کو روانہ ہونے سے ایک دن پہلے جو اُن مقاموں میں گیا۔ جن کو اُس نظارہ نے میرے لئے مقدس بنا دیا تھا تو دیکھا۔ کہ چشمے کا سینہ منجمد تھا۔ اور قوس قزح والی پہاڑی پر سوائے برف اور موسم سرما کی دھوپ کے اور کچھ نہ تھا۔ میں نے سوچا "مجھے اُمید قائم رکھنی چاہیئے ورنہ میرا دل ایسا ہی برف سا ٹھنڈا ہو جائے گا۔ جیسا یہ چشمہ ہے۔ اور تمام دُنیا ایسی ہی ویران سنسان دکھائی دے گی۔ جیسی یہ پہاڑی ہے۔ دن کا اکثر حصّہ سفر کی تیاری میں گذر گیا۔ کیونکہ اگلی صبح کو چار بجے چلنا تھا۔ شام کو کھانا کھانے سے ایک گھنٹہ بعد جب سب تیاری ہو چکی۔ میں اپنے کمرے سے اُتر کر نشستگاہ میں گیا تاکہ پادری صاحب اور اُن کے کنبے سے جن کے گھر میں میں رہتا تھا۔ رخصت ہو لوں۔ میں جو دروازے سے گذرا۔ تو ہوا کے ایک جھونکے نے میرا لیمپ گل کر دیا۔

تمام کنبہ حسب معمول نشستگاہ میں بیٹھا تھا۔ اور سوائے اس روشنی کے جو چولھے سے آتی تھی اور کوئی روشنی نہ تھی۔ چونکہ اس نیک دل پادری کی قلیل تنخواہ اُسے ہر قسم کی کفایت شعاری پر مجبور کرتی تھی۔ اس لئے اُس کے ہاں آگ کی

بنیا دہمیشہ موٹی موٹی چھال ہوتی تھی۔ جو صبح سے رات تک سلگتی رہے اور خفیف گرمی پیدا کرے اور شعلہ نہ نکلے۔ اس شام کو چھال کا تو وہ نیا لگایا گیا تھا۔ اور اُس کے اُوپر شاہ بلوط کی تین گیلی شاخیں اور خشک چیڑ کے چند ٹکڑے تھے۔ جو ابھی سلگے نہ تھے۔ روشنی بالکل نہ تھی سوائے اُس کے جو دو نیم سوختہ لکڑیوں سے آتی تھی۔ جس سے انگیٹھی کے سرے بھی بالکل نہ ڈھکے تھے۔ مگر میں جانتا تھا۔ کہ بڈھے پادری کی آرام کرسی کہاں ہوتی ہے۔ اور اُس کی بیوی کہاں بیٹھ کر جرابیں بُنا کرتی ہے۔ اور اُس کی دو لڑکیوں سے کیونکر کترانا چاہیئے۔ جن میں سے ایک تو موٹی دیہاتی لڑکی ہے۔ دوسری مرض سل کی کھائی ہوئی ہے۔ اندھیرے میں میں ٹٹولتا ٹٹولتا پادری کے بیٹے کے پاس جا بیٹھا۔ یہ ایک کالج کا فاضل تھا۔ اور وُہ سردی کی تعطیل میں گاؤں میں مدرسہ پڑھانے آیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میرے اور فاضل کی کرسی کے درمیان معمول سے کم جگہ تھی۔

چونکہ لوگ اندھیرے میں ہمیشہ خاموش رہا کرتے ہیں۔ میرے وہاں پہنچنے سے کچھ دیر بعد تک ایک لفظ تک بھی نہ بولا گیا۔ خاموشی میں سوائے بڑی بی کے جراب بننے کی ٹک ٹک کے اور کوئی آواز خلل انداز نہ ہوئی۔ کبھی کبھی آگ ایک دھندلی سی روشنی ذرا سی دیر کے لئے ڈال دیتی تھی۔ جو بڈھے کی عینک پر ٹمٹماتی تھی۔ اور ہمارے حلقے کے گرد کچھ شک کے سے عالم میں منڈلاتی تھی لیکن اس قدر دھندلی تھی۔ کہ ہمارے مجمع کے افراد کا نقشہ نہیں کھینچ سکتی تھی۔ مجھے خیال ہُوا کیا ہم رُوحوں کے مانند نہیں ہیں؟ یہ منظر خواب سا تو ہے ہی۔ مگر کیا جس طرح رہنے والے جنہوں نے دُنیا میں ایک دُوسرے کو جانا اور چاہا ہے۔ ابدالآباد عاقبت جو ملیں گے۔ اُس کی یہ ایک مثال نہیں ہے؟ ہم اس وقت ایک دُوسرے کی ہستی سے آگاہ ہیں مگر نہ نظر کے ذریعہ سے۔ نہ آواز کے ذریعہ سے۔ نہ چھونے سے۔ بلکہ ایک باطنی آگاہی کے ذریعے سے۔ کیا خفتگانِ خاک میں بھی ایسا ہی نہیں ہوتا؟

اِس خاموشی کو اس سل زدہ لڑکی نے توڑا۔ اور اُس نے اس مجمع میں کسی

سے ایک بات کہی جس کو اُس نے راشل کہہ کر پکارا۔ اُس کی کانپتی ہوئی اور مریل آواز کا جواب ایک ہی لفظ سے ملا۔ جس کو سُن کر میں چونک اُٹھا۔ اور اُس طرف کو جُھک کر دیکھنے لگا۔ جدھر سے یہ آواز آئی تھی" کیا میں نے کبھی یہ میٹھی میٹھی دھیمی دھیمی آواز سُنی ہے؟ اگر کبھی نہیں سُنی ہے؟ تو اُس کے سُننے سے اِس قدر پُرانی یادیں یا یادوں کے ہمزاد اور آشنا لیکن نامعلوم چیزوں کے سائے کیوں تازہ ہوتے ہیں؟ اور کیوں اِس کے چہرے کی بے ترتیب تصویروں سے میرا دل بھرا جاتا ہے۔ اگرچہ وہ اِس نشستگاہ کی تاریکی میں غائب ہے؟ میرے دل نے کس کو پہچان لیا۔ کہ اِس طرح دھڑکنے لگا؟؛ میں اُس کے پاس سانس کی آواز سُننے کے لیئے متوجہ ہوا۔ اَور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا کہ اُس کی شکل کی جو دکھائی نہ دیتی تھی۔ تصویر کھینچوں۔

یکا یک خشک چیڑھ جل اُٹھا۔ آگ سُرخ شعلے سے جلنے لگی اور جہاں پہلے اندھیرا تھا۔ وہاں وہ نظر آئی یعنی اُس چشمے والا نظارہ! وہ محض ایک نور کی روح تھی کہ قوس قزح کے ساتھ غائب ہوگئی تھی۔ اور اب آگ کی روشنی میں شاید اِسلیئے ظاہر ہوئی تھی۔ کہ شعلے کے ساتھ ذرا کی ذرا چمکے اَور کافور ہو جائے مگر اِس کا رُخسار گلابی اور انسانوں کا سا تھا۔ اَو اِس کا چہرہ کمرے کی گرم روشنی میں اِس سے بھی زیادہ پیارا اَور محبت آمیز دکھائی دیتا تھا۔ جیسا میری یاد میں سمایا ہُوا تھا وہ مجھے جانتی تھی۔ وہ بشاشت آمیز تبسّم جو اُس کی نگاہوں میں تھا اَور جس سے اِس کے چھوٹے پر (جب میں نے اُس کے نازک حسن کو چشمے میں دیکھا تھا گڑھے پڑتے جاتے تھے۔ اب بھی اُسی طرح موجود تھا۔ ایک لمحے کے لئے ہماری نگاہیں چار ہوئیں۔ دوسرے لمحہ میں جلتی ہوئی لکڑی پر چھال کا ڈھیر آ گرا۔ اور تاریکی اُس نورانی نژاد کو مجھ سے چھین لے گئی

حسین نازنینو! یہ کہانی یہیں ختم ہے۔ کیا یہ سیدھا سادا راز بتلا ہی دوں راشل اِس گانوں کے رئیس کی بیٹی تھی۔ اَور جس روز میں گانوں میں تھا۔ اُس

سے اگلی صبح کو گاؤں سے ایک مدرسے کو چلی گئی تھی اور میرے گاؤں سے روانہ ہونے سے پہلے دن وُہ واپس آگئی تھی۔ اگر میں نے اُسے فرشتہ بنا دیا ہے۔ تو یہ نقشہ تو ہر نوجوان عاشق اپنی معشوقہ کا کھینچتا ہے۔ میری کہانی کا عطر یہ ہے۔ پیاری نازنینو! تم کو فرشتہ بننے کے لئے بہت ہی کم بدلنے کی ضرورت ہے۔

ترجمہ

دستار

ٹوپی پر جو مضمون لکھا جا چکا ہے۔ اُسے پڑھ کر ایک نقادِ سخن نے یہ رائے لکھی ہے "بہت سی ٹوپیاں ملاحظہ سے رہ گئیں۔ عمامے پر بھی نظر ہونی چاہیئے تھی۔" بے شک کئی ٹوپیاں ابھی منتظر توجہ ہیں۔ اور کیا عجب ہے۔ کہ اُن کی پرسش کا بھی کوئی دن آجائے۔ سر دست دستار سے دو دو باتیں ہو جائیں۔ خدا جانے الفاظ میں تاثیر کہاں سے آجاتی ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ اس سے آگاہ نہ ہوں لیکن میرا یہ ایمان ہے۔ کہ بعض لفظ بنے ہی ایسے ہوتے ہیں۔ کہ معزز معلوم ہوں۔ اور بعض ایسے خفیف ہوتے ہیں کہ نظر میں نہ جچیں۔ شاید کوئی صاحب کہیں۔ کہ محض پُرانے اور دبے سے دلنشین شدہ خیالات سے کہتے ہو۔ مگر میرے ذہن میں لفظ دستار باوجود زمانہ کی ناقدر شناسی کے کانوں کو معزز معلوم ہوتا ہے۔ اور ٹوپی باوجودیکہ مقبول عام کا طرّہ اُس کے سر پر ہے۔ کچھ ہلکی سی چیز نظر آتی ہے۔ دستار کسی زبان میں اس کا نام لو۔ ایک متانت اور سقاہت کا بوجھ سنبھالے ہوئے معلوم ہوتی ہے پگڑی ہی دیکھیئے۔ تعداد حروف اور وزن تو وہی ہے۔ جو ٹوپی کا۔ مگر اُس سے کسی قدر بھاری بھرکم ہے۔ اِس کے تلفظ میں بھی ایک قسم کی گرانی ہے۔ اور یہ گرانی کچھ لفظی ہی نہیں قیمت میں بھی پگڑی ٹوپی سے گراں قدر ہے ململ کی سادہ یا بیلدار ٹوپی چند آنوں میں ملے۔ تو پگڑی چند روپوں میں۔ ٹوپی اگر طلائی کام کی یا سلمے کی یا لیسدا ہو۔ تو معمولی پانچ سات روپے میں۔ لیکن پگڑی اگر ریشمی یا زرکار یا اور کسی طرح کے تکلف والی ڈھونڈو تو بیس روپے سے لے کر سو روپے تک کی کسی بامذاق آدمی کے سامنے اس کا عربی نام لیجئے "عمامہ" دیکھئے۔ کتنی وقعت اُس کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اول تو عمامہ خود معتبر چیز ہے۔ دوسرے معتبروں کی صحبت میں

معتبر بن گیا ہے۔ جب اس کا ذکر سُنو۔ کسی بزرگ کے نام کے ساتھ آتا ہے۔ کچھ نہ ہو تو زاہد یا شیخ گویا اُن کے ساتھ مخصوص ہو گیا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں ؎

دیکھنا محفل رندان میں نہ آنا اے شیخ
یہ وہ محفل ہے۔ کہ عمامہ اُچھل جاتا ہے

اس شعر سے دو مطلب نکلتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ شیخ صاحب عمامہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کے نزدیک عمامہ عزیز ترین مقبوضات ذاتی ہے جس کے متعلق خوف دلانے سے گویا اُس کے شریک محفل ہونے کا احتمال بھی نہیں رہے گا۔ اسی طرح ایک اور رند مشرب حضرت فارسی میں فرماتے ہیں ؎

در کوئے مغاں زاہد رہ نیست تکلف را
گیرم کہ تو گنجیدی عمامہ نمے گنجد

یہاں عمامہ زاہد کی ملک قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کا رُعب اس درجہ ہے کہ مجمع رندان اِس سے گھبراتا ہے۔ اور اِس لئے چاہتا ہے۔ کہ عمامہ اُن کے تخلیہ میں خلل انداز نہ ہو۔ اور اِس کو ایک ایسی بڑی چیز قرار دیتا ہے۔ کہ خود زاہد سما جائے تو سما جائے مگر عمامہ کے لئے گنجایش کہاں۔ دستار کی فضیلت اسی سے ظاہر ہے۔ کہ دستار فضیلت کا یہ ایک جزو ہے۔ پگڑی کی توقیر میں اتنا کہنا کافی ہے کہ اب تک ہمارے دیہات میں سر پر پگڑی ہونا سرداری کی علامت ہے۔ یہ نہ سمجھنا۔ کہ بعض پرانے توہمات اور قدیم رواج ہیں۔ بلکہ ٹوپی پوش حکمران خود پگڑی کے قدر دان ہیں۔ عدالتوں اور دفاتر سرکاری کا ایک آن لکھا قانون ہے کہ لوگ پگڑی باندھ کر آئیں۔ کلکتہ میں بنگالی لوگ جو ٹوپی اور پگڑی دونوں کی قید سے آزاد ہیں۔ اور قدرت کی بنائی کھوپری اور اس پر روغن ناریل سے تر بتر کنگھی کئے ہوئے بالوں کو کافی زینت سمجھتے ہیں۔ عدالت کی کرسی پر بیٹھتے وقت ایک گول سی بندھی بندھائی پگڑی سر پر دھر لیتے ہیں۔ وہی نشان حکومت ہے اور وہی تمغائے لیاقت۔ گھر گئے اور پگڑی اُتار کر رکھ دی۔ گویا ججی یا منصفی سے سبکدوش

ہوئے۔ اور گھر پر سیدھے سادے بڑے بڑے بنگالی بن کر آرام اور بے فکری سے بیٹھ گئے۔ اِدھر صوبجات متحدہ کی جانب چلے آیئے۔ اور آپ دیکھیں گے کہ پنڈت جی ہیں۔ تو اپنی گھٹی ہوئی پگڑی پر نازاں ہیں۔ اور سیٹھ جی مہاراج کو اگر کوئی چیز گماشتوں۔ دلالوں اور عام بیوپاریوں سے ممتاز کرتی ہے۔ تو گلابی رنگ کی ایک ذراسی پگڑی ہے۔ جسے قالبوت پر رکھ کر باندھتے رہنا بعض غریب لوگوں کا ذریعہ معاش ہے۔ اور مولوی صاحب کا تو کیا ہی کہنا اُن کا عمامہ تو مولویت کا جزو ضروری ہے۔ جنوب ہو یا شمال۔ ہند ہو یا سندھ۔ کشمیر ہو یا میسور مولوی صاحب کا عمامہ موجود ہے۔ تھوڑے تھوڑے فرق سے یہ دو شعر اکثر مولوی صاحبان کے لئے موزون معلوم ہوتے ہیں ؎

دینا جا رد ب سر خاک ہے جامہ اُن کا

چھتریاں سر پہ لگائے ہے عمامہ اُن کا

سر پہ دستارِ فضیلت کی بہت بھاری ہے

پیٹ اُن کا تو کتب خانہ کی الماری ہے

جنوبی ہندوستان کو دیکھو۔ تو اہل مدراس نے پگڑی کی قدر پہچانی ہے۔ یعنی اِس درجے تک کہ جوتے کو بھی اُتار پھینکا ہے۔ عجب مزا آتا ہے جب کسی پرانے ڈھنگ کے مدراسی کو دیکھیں۔ کوٹ بھی ہے۔ پتلون بھی۔ کالر بھی۔ سر پر دوپٹہ بنارسی تیس چالیس روپے کا بندھا ہوا ہے۔ مگر پاؤں پر نظر ڈالو تو جرابوں کے تکلف سے بھی فارغ ہیں۔ اچھے اچھے معزز ننگے پاؤں ربٹ پر یوں دوڑتے پھرتے ہیں۔ کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے اہل بمبئی کا تو کیا کہنا۔ انھوں نے تو عمامہ کو اپنی اصلی خوبی کے ساتھ قائم رکھا ہے۔ مرہٹوں کی پگڑی بھی ایک خاص بانکپن رکھتی ہے۔ مگر اس کے نیچے منڈے ہوئے سر کی نمائش اسے کسی قدر زیب بنا دیتی ہے۔ مگر بمبئی کے مسلمانوں کی خوبصورت عبائیں۔ اُن پر لمبی لمبی قبائیں اور سروں پر خوشنما اور قیمتی عربی عمامے۔ اُن کے تمول۔ اعتبار اور اعزاز کی مجازی

علامتیں ہیں۔کاش یہ عمامے ساتھ علمی فضیلت بھی لئے ہوتے۔پھر تو ہم مسلمانان بمبئی کو دوسرے مقامات کے لوگوں کے لئے نمونے کے طور پر پیش کر دیتے۔پارسیوں کا لباس سر بھی درحقیقت ایک قسم کی بندھی بندھائی پگڑی ہے۔اور وہ اس قدر بلند۔دبیر یا اور مضبوط ہوتی ہے۔کہ زبان حال سے یہ کہتی ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستان کی قوموں کی لاج اسی پگڑی نے رکھی ہے۔وسط ہند اور راجپوتانہ کی ریاستوں میں آئیں تو پگڑی ایک خاص سپاہیانہ ٹھاٹھ بدلتی ہے تصویریں ہوں۔تو دکھائیں۔کہ فوجی جوان کس آن بان سے پیچ دار دوپٹے زیب سر کر کے اتراتے پھرتے ہیں۔کجکلاہی کے بجائے کج دستاری سے کام لیا ہے۔ایک طرف پگڑی کے پیچ کان سے دور اوپر کی طرف بھاگے جاتے ہیں۔ایک طرف پہاڑ کی چوٹی ہے۔تو دوسری طرف وادی۔غرض پگڑی کیا ہے۔نشیب و فراز عالم کی تصویر ہے۔اس پگڑی میں ایک چیز اور ہے۔جس کے دکھانے سے عکسی تصویر بھی قاصر ہے یعنی اس کے خوشنما رنگ۔معلوم ہوتا ہے وردی میجر صاحب نے قوس قزح آسمان سے چھین کر سر پر لپیٹ لی ہے۔

یوں تو ہندوستان کے ہر حصے میں دستار کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے مگر ہمارا پنجاب تو اس کا گھر ہے۔یہاں اس کی بن آئی ہے۔جتنی بڑی ہو۔اتنے ہی آپ امیر۔اتنے ہی معتبر۔چھوٹی سی پگڑی باندھ کر کوئی باہر نکلے۔تو کہتے ہیں:۔ ”ارے میاں! یہ کیا لنگوٹی سی سر پر باندھ رکھی ہے“ بہاول پور۔ملتان۔ڈیرہ جات ان اطراف میں تو پورا تھان سر پر دھر لیتے ہیں۔اور اس پر بھی قانع نہیں۔اگر اور بڑے تھان ولایت سے بن کر آنے لگیں۔تو اس نواح میں بڑے گاہک ہیں۔ان پگڑیوں میں ایک خوبی ہے۔ان کے پیچ ایسے عجیب ہوتے ہیں۔کہ گویا بیقاعدگی میں باقاعدگی لپٹی ہوئی ہے۔بظاہر کوئی کدھر گیا ہے۔اور کوئی کدھر اور ایک شخص کی بندش دوسرے سے نہیں ملتی۔پیچ دیوانے معلوم ہوتے ہیں مگر ان کی دیوانگی میں بھی ایک ”ترتیب“ ہوتی ہے۔بڑے شہروں میں اور

خصوصاً پنجاب کی ریاستوں کے دارالخلافوں میں زنگار رنگ کی پگڑیاں عجب بہار دکھاتی ہیں۔ سرحد پنجاب میں پگڑی کو زیادہ وزن دار بنانے کے لئے ایک خاصہ بوجھل گلہ (جو چھوٹے پیمانہ پر مصر کا مینار ہوتا ہے مخروط) جزو دستار قرار دیا گیا ہے اور اس کی ساخت میں بہت محنت صرف کی جاتی ہے۔ اس زمانہ میں زندگی کے مختلف صیغوں میں ان دستار کی بھی ناموری بڑھ چلی ہے۔ کیا ہوا اگر بنگالہ کے لوگ اسے اُتار کر پھینکنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ اور بمبئی مدراس والے دستار وقت ضرورت پہنتے ہیں۔ جب تک پنجاب کے دم میں دم ہے۔ پگڑی کا بھرم کھلنے نہیں پائے گا۔ بلکہ اور لوگ بھی اس کا دم بھرنے لگیں تو عجب نہیں۔ کیا انہیں معلوم نہیں۔ کہ پنجاب میں سب سے زیادہ خصوصیت اسے سکھوں کی قوم سے ہے (ان کے لمبے بال کسی اور لباس میں سنبھالے ہی نہیں جا سکتے) اور سرکار دولتمدار کی نظر میں سب سے منظور نظر قوم اس وقت سکھوں کی ہے۔ جو دستار کی فضیلت سے اب تک منکر تھے۔ اور اس کی بزرگی میں شک رکھتے تھے۔ اُن کیلئے یہ دلیل قطعی ہونی چاہیئے۔ کہ سکھوں کے سر پہ پگڑی ہے..... .....اور اُس پگڑی پہ لارڈ کرزن بہادر کا ہاتھ ہے۔

محمد اکرام

چاند اور ستارے

یہ پُرانی کہانی ہے۔ ایک پروفیسر صاحب نے انگریزی زبان سے اخذ کر کے ہمیں عنایت کی ہے۔ وُہ تو کسرِ نفسی سے فرماتے ہیں۔ کہ اِس پر صرف یہ لکھ دیا جائے۔ کہ ایک کالج کے پروفیسر کی مترجمانہ کوشش، مگر ہم جانتے ہیں۔ کہ اسے محض ترجمہ کہنا قابل مضمون نگار کی حق تلفی ہوگی۔ انگریزی مضمون نے پروفیسر صاحب کی سحر تاثیر طرزِ تحریر میں وہ روپ نکالا ہے۔ کہ فرنگی زاد نظر آنے کے بجائے ہندی نژاد معلوم ہوتا ہے۔

دنیا کی پیدائش کا چوتھا دن جب ختم ہوُا۔ اور آفتاب عالم تنہائی میں اپنا پورا جاہ وجلال دکھا کر غروب ہو گیا۔ اور روئے زمین پر جس کو ابھی تک آبادی کا شرف نہیں حاصل ہوا تھا۔ تاریکی پھیلنے لگی۔ تو ایک اکیلا مگر خوبصورت ستارہ آسمان پر نمودار ہوا ۔ اپنے نئے خلعتِ وجود میں حیرت اُور خوشی کے ساتھ کانپتے ہوئے اُس نے اپنے چاروں طرف نظر جو دوڑائی۔ تو دیکھا کہ نہ آسمان پر اُس کا کوئی ثانی ہے۔ نہ زمین پر۔ لیکن بہت زیادہ زمانے تک وُہ اکیلا نہ رہا۔ ابھی ایک پھر دوسرا پھر تیسرا چمکیلا ہم چشم اُس سے آملا۔ یہانتک کہ ایک گھنٹے میں سارا آسمان سیارات اُور ثوابت سے جگمگا اُٹھا۔ جن میں ایک عظیم الشان دُمدار ستارہ بھی تھا۔ جو سمت الراس پر چمک رہا تھا۔

ان اجرام فلکی نے کچھ دیر تک اپنی حالت اور ایک دوسرے کی حالت پر غور کی اور ان میں سے ہر ایک نے چاہے چھوٹا ہو یا بڑا دل میں خیال کیا۔ کہ تمام عالم کا نورانی مرکز میں ہی ہوں۔ اُن کو اپنی نسبت جو یہ مغالطہ واقع ہوا تھا۔ وُہ رفع نہ ہوا۔ اگرچہ سب کے سب اپنے ہم چشموں کے قد و قامت میں

اختلاف اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے (وجہ یہ تھی کہ ذات کا علم چاہے آسمان پر ہو یا زمین پر سب سے آخیر ہیں حاصل ہوتا ہے) تا وقتیکہ انہوں نے جھانک کر سمندر کے آئینے میں اپنی اپنی صورتیں دیکھ نہ لیں۔ جو ٹھیک ٹھیک اُن کا خط و خال و محل و مقام دکھاتا تھا۔ توجّہ کے ساتھ اِس آئینے میں اپنا ذاتی خط دیکھتے دیکھتے سب کو بندریج عاجزی اور انکسار کا سبق یاد ہو گیا۔ نہ ہوا تو ایک دُمدار ستارے کو جو اپنی آفتاب تک پھیلی ہوئی چمکیلی دم پر ایسا بھولا ہوا تھا کہ اب بھی اپنے آپ کو آسمان کا بادشاہ ہی خیال کرتا تھا۔

جب وُہ اِس طرح اپنے آپ کو اور ایک دوسرے کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ اُن کی توجّہ ایک بار ایک نورانی جماعت مقبش کے تار کی طرف منعطف ہوئی۔ جو تھوڑی دیر تک افق سے اُوپر چمک کر نظروں سے غائب ہو گیا۔ یہ چاند تھا۔ پہلی تاریخ کا نیا چاند۔ خوف زدہ ادا سے اُس نے اُس چمکیلے گروہ پر نظر کی اور جب اُس نے دِل میں خیال کیا۔ کہ میرا لاغر اور بے کینڈے جسم اُن کے کامل تناسب اعضا کے مقابل میں کیسا ذلیل اور بے حقیقت ہے۔ تو سمندر کے دوستانہ دامن میں اُن کی نظروں میں اپنا مُنہ چھپا لینا اُسے ایک خوشی کی بات معلوم ہوئی۔ جب وہ نظروں سے غائب ہو گیا۔ تو ستارے ایک دوسرے کو متجسسانہ نگاہ حیرت سے دیکھنے لگے۔ گویا زبان حال سے یہ کہتے تھے۔ کہ "سبحان اللہ! کیا صورت تھی۔ صدقے اِس صورت کے!!" اور وُہ پھر جلد جلد آزادی کے ساتھ اُس کے باب میں گفتگو کرنے لگے۔ لیکن جس حال میں کہ وُہ اُس کی خمیدہ پشت اور اُس کی نادیدہ ادا کی ہنسی اُڑا رہے تھے۔ یکایک انہیں معلوم ہوا کہ خود اُن کی روشنی بھی مدھم پڑتی جاتی ہے۔ پُورب کی طرف پَو پھٹنے لگی۔ اور بڑی حیرت کے ساتھ سب نے دیکھا۔ کہ مدھم پڑتے پڑتے آنکھوں سے غائب ہوئے جاتے ہیں۔ بلکہ انہیں ڈر ہوا۔ کہ کہیں سرے سے بالکل غائب ہی نہ ہو جائیں۔

یہ خواب عدم میں پڑے ہوئے اجرام فلکی دوسری شام کو آنکھیں ملتے ہوئے بتدریج پھر بیدار ہوئے۔ اور آنکھیں کھول کر جب انہوں نے دیکھا کہ کل کی رات کی انجمن پھر جوں کی توں موجود ہے۔ تو دل میں بہت ہی خوش ہوئے وہ چھوٹی چمکیلی شاخ بھی پھر نظر آئی۔ جو مغربی پہاڑوں کے سلسلے پر نیچے کو جھکی ہوئی تھی۔ لیکن اگرچہ پہلی دفعہ سے اب کسی قدر زیادہ چمکیلی تھی۔ وہ پھر بھی جلد دامن افق میں غائب ہو گئی۔ اور دُمدار ستارے کو سارے آسمان پر مغرورانہ ادا سے قابض چھوڑ گئی

تیسری شام کو چاند قد آور روشنی میں اس قدر بدیہی طور پر بڑھ گیا تھا اور پہلے دن کی نسبت آسمان میں اس قدر اوج گزا تھا۔ کہ اگرچہ وہ اب بھی جلدی نظروں سے غائب ہو گیا۔ مگر کہکشاں کی وہ نوجانب شروع سے آخیر تک مضمون گفتگو وہی تھا۔ یہاں تک کہ نو پیدا شدہ آدمی کو اس کی پہلی میٹھی نیند سے جس میں وہ پڑا بہشت میں سوتا تھا۔ جس نسیم نے آکر جگایا۔ اس نے ستاروں کو آکر اطلاع دی۔ کہ اب میدان خالی کرو۔ آفتاب اپنے جاہ و جلال کے ساتھ آتا ہے اور دنیا کی پیدائش کا پہلا سبب ایسے جاہ و جلال کے ساتھ لاتا ہے۔ جس کے دیکھنے کو دنیا کے انحطاط کے زمانے میں لوگوں کی آنکھیں ترسیں گی۔ اگلی رات کو چاند نے اپنی کرسی اور بھی بلند کر دی۔ اور پہلے سے کہیں زیادہ چمکدار دکھائی دیا یہاں تک کہ اس کے آس پاس جتنے چھوٹے ستارے تھے۔ ان کو سب نے دیکھا۔ کہ زرد پڑ گئے تھے۔ اور بعض تو نظر بھی نہ آتے تھے۔ چونکہ ان کے رفقا اس کی توجیہ معقول نہ کر سکتے تھے۔ انہوں نے قیاس کیا۔ اور ایسا قیاس انہیں کرنا ہی چاہیئے تھا۔ کہ چاند کی روشنی جو بڑھ رہی ہے۔ تو انہی کی روشنی سے گویا چاند ایک ایک کر کے سب کو نگل رہا ہے۔ اور یہ خوف تمام میں عام پر پھیل گیا۔ کہ چاند جوں جوں بڑھتا جائے گا۔ ہم سب کو نگلتا جائے گا۔ یہاں تک کہ ہم میں ایک فرد بھی باقی نہ رہے گا۔

اگرچہ چاند ہر شب اسی طرح بڑھتا اور روز بروز خوبصورت ہوتا جاتا تھا مگر پھر بھی وہ اپنا انکسار اور تواضع نہ چھوڑتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کا ہلال بڑھتے بڑھتے شکلِ بدر میں آگیا۔ تب کسی قدر وُہ اپنی فوقیت پر نازاں نظر آیا۔ اُس کی شعاعیں بھی ایسی تاباں و درخشاں ہو چلیں۔ کہ بہت کم ستارے اُس کے جلوے کی تاب لا سکتے تھے۔ دُمدار ستارہ بھی اُس کے آگے پھیکا پڑ گیا۔ اپنے کمال کی شب کو وہ نہایت جاہ و جلال کے ساتھ وسطِ آسمان میں کرسی حکومت پر جلوہ گر ہوا۔ اور زمین کو دن کا سا ایک خاص نازک اطلسی خلعت عنایت کیا آئینہ بحر میں جو اُس نے اپنی صورت دیکھی۔ تو اپنے عالم حسن پر گھنٹوں محوِ حیرت رہا۔ کچھ ستارے جواب بھی بے حیائی سے آسمان پر چمکے جاتے تھے۔ اُن کی زیادہ نیلگوں گہرائی میں جا چھپے کہ ایک محفوظ فاصلے سے اُس کے سب پر غالب آجانے والے حسنِ تاباں کا نظارہ کریں۔

چاند بھی اِس خیال سے کچھ کم متحیر نہ تھا۔ کہ دیکھو تو دیکھتے دیکھتے قد اور روشنی میں میں کس قدر بڑھ گیا۔ اور نہیں معلوم ابھی اور کہاں تک بڑھوں گا۔ اُس کی خود بینی نے اُسے یہ سمجھایا۔ کہ اگرچہ شکل تو میری پُوری بن گئی ہے۔ لیکن قد ابھی اور بڑھے گا۔ کیا میں بڑھتے بڑھتے اتنا بڑا نہیں ہو جا سکتا کہ آدم اور اُس کی ہم خوابہ حوّا باغ عدن کے کسی گوشہ سے جھانک کر دیکھیں۔ تو انہیں بھی آسمان میں چاند ہی چاند نظر آئے؟ لیکن وُہ اِسی دِل خوش کن خیال میں مست تھا۔ کہ یکایک اُس پر ایک سیاہ جھائیں نمودار ہوئی۔ جو ایک کنارے سے بڑھتے بڑھتے اُس کی سطح کو سیاہ کرتی ہوئی دُوسرے کنارے تک چھا گئی جس سے اُس کا سارا چہرہ گہنا گیا۔ اور لوحِ آسمان پر ایک بدنما داغ سے زیادہ اس کا رُتبہ نہ رہا۔ اس مصیبت کو آتے دیکھ کر ستارے اپنے اپنے گوشے سے چاند کی ذلّت کا تماشہ دیکھنے کو نکل آئے۔ لیکن اُن کی خوشی اور چاند کی ذلّت کچھ بہت دیر تک نہ رہی۔ جھائیں جس طرح بڑھی تھیں۔ اُسی طرح رفتہ رفتہ

گھٹ بھی گئی۔ اور اب چاند پہلے سے زیادہ خوبصورت اور چمکدار نظر آنے لگا۔

دوسرا دن گذر گیا۔ اور دوسری رات آئی۔ اور اپنے معمول کے مطابق چاند پھر نکلا۔ مگر کسی قدر دیر بعد۔ جبکہ وُہ زمین کے اُوپر چل رہا تھا۔ اُس وقت بھی یہ خوف اُس کے دل میں گذر رہا تھا۔ کہ میری چمک جتنی کل تھی۔ اتنی آج نہیں مگر جب اس نے اپنا چہرہ دریا میں دیکھ لیا۔ تو پھر یہ نامبارک نقص اُس کے دل پر آئینہ کی طرح روشن ہو گیا۔ موسم شور انگیز تھا۔ ہوا میں یکایک تیزی پیدا ہوئی۔ اور موجیں اُٹھ کر مُنہ میں جھاگ بھر لائیں۔ شاید جوار پہلے ہی بہل چاند کی ہمدردی کو اُٹھا تھا۔ اور جو بات پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ وہ یہ تھی۔ کہ ایک خوفناک طوفان نے بجلی سے آسمان کو دہلا دیا۔ اور منہ سے زمین کو نہلا دیا۔ چاند نہایت گھنگھور بجلیوں والی گھٹا کی جھپٹ میں آ گیا۔ حالت اضطراب میں۔ جس سے چاند کی ذلّت ڈھکی رہی۔ اُس کے خوش ہونے والے حریف بھی نہیں معلوم کہاں جا چھپے۔

دوسری شام کو اور اِسی طرح بعد میں بھی کئی شاموں تک چاند دیر کر کے نکلتا رہا۔ اور روز بروز دھندلا ہی ہوتا جاتا تھا۔ اور اُدھر حال یہ تھا۔ کہ ہر موقعے پر وہ چھوٹے ستارے جو اُس کے آگے پہلے غالب ہو گئے تھے۔ زیادہ نکلتے آتے تھے۔ اور اُس کے زوال پذیر عزّت و جلال اور نقصان پذیر حسن و کمال کو دیکھ دیکھ کر خوشی سے جامے میں پھُولے نہ سماتے تھے۔ کامیابی نے چاند کو خود بین اور مغرور بنا دیا تھا۔ مصیبت نے اُس کے خیالات کی اصلاح کی۔ اور عجز و انکسار کے نرم نرم دلفریبیوں سے پھر وہ جگہ دلوں میں حاصل ہوئی۔ جو غرور کے ہاتھوں چھن گئی تھی۔ کیونکہ جب اُس کی بدری شکل گھٹ کر آخیر حصّہ ماہ میں خمیدہ ناخن کی شکل رہ گئی۔ تو سارے آسمان والوں کی نظر میں سب دنوں سے وہ زیادہ ڈھنگ کا نظر آیا۔

آخر کار ایک رات ایسی بھی آئی۔ جب کہ چاند کا کہیں پتہ نہ تھا۔ دمدار

ستارہ بھی کسی غیر معلوم حصے میں چلا گیا تھا۔ اُس شب کو ساری رات آسمان پر سناٹا رہا۔ مہینے کے انقلاب پر اطمینان کے ساتھ غور کرتے ہوئے ستاروں نے غروبِ آفتاب سے طلوعِ فجر تک اپنا سفر طے کیا اور تجربے سے عقل حاصل کر کے متواضع اور راضی برضا رہے۔ اور ہر ایک اپنی تقدیر پر شاکر تھا۔ چمکی ہوئی تھی۔ جب بھی اور نہ چمکی ہوئی تھی جب بھی۔

دوسری شام کو چاند نئے ہلال کی صورت میں مطلعِ مغرب سے پھر نمودار ہوا۔ جس سے سب کو حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ فوراً آسمان کے ہر حصے سے اُس کو سبھوں نے اس پھر جی اُٹھنے پر دل سے مبارکباد دی۔ کہتے ہیں۔ کہ ٹھیک اُس وقت جب کہ وہ غروب ہو رہا تھا۔ اور جب کہ اُس کی کمان دھندلے بیگنی اُفق پر ابھی لٹک ہی رہی تھی۔ ایک فرشتہ نمودار ہوا۔ جو اُس کے دونوں سِروں کے بیچ میں خاص ادا سے کھڑا تھا۔ جب اُس نے مُڑ کر دیکھا۔ تو اُس کی آنکھ جلدی سے اِس سرے سے اُس سرے تک تمام دنیا پر پھر گئی۔ آفتاب تو نہیں معلوم کہاں کتنا نیچے ڈوبا پڑا تھا۔ چاند اُس کے زیرِ قدم ہی تھا۔ نیچے زمین جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی۔ فرشِ زمردیں بچھا رہی تھی۔ اُوپر آسمان برج برج میں چراغاں کر رہا تھا۔ وہ آن کی آن ٹھہر گیا۔ اور پھر اُس زبان میں جس میں صبح کے ستاروں نے مل کر گایا تھا۔ اور بندگانِ خدا نے خوشی کے نعرے مارے تھے۔ اس طرح زمزمہ سنج حمد و ثنا ہوا:-

"اے صانعِ مطلق! اے حکیم برحق۔ تیری صنعتیں بڑی اور حیرت میں ڈالنے والی ہیں۔ جس چیز کو دیکھتا ہوں۔ تیری حکمت اُس سے آشکار ہے۔"

اتنا کہکر وہ تو خاموش ہو گیا۔ مگر وہ زمزمہ آسمان کے گنبد میں اُس وقت سے آج تک برابر گونج رہا ہے۔

تصویر کے دو رُخ (۲)

یوں تو ہر تصویر کے ۲ دو رُخ ہوتے ہیں۔ ایک روشن اور ایک تاریک ایک سفید اور ایک سیاہ۔ ایک طرف نقش و نگار اور ایک طرف ورق سادہ ایک رُخ خط و خال کی آرائش سے زیبا اور دوسرا حسن و خوبی سے معرّا۔ مگر جو دردناک اور تعجب خیز نظارہ اہل ہند کی روزمرہ زندگی کی تصویر کے ۲ دو رخ دکھاتے ہیں بہت کم تصویریں دکھا سکتی ہیں افسوس! اس تصویر کی نقل اُتارنے کیلئے جیسے صاحبان فن کی ضرورت ہے۔ وہ میسّر نہیں۔ نقاش ازل نے بھی اُسے کھینچ کر "دست از قلم کشید" پر عمل کر لیا ہے اور جب کبھی کسی مصوّر نے اُس کا نقشہ اُتارنے کی کوشش کی ہے۔ وہ نور اور پرتو دونو کو یکساں تناسب کے ساتھ دکھانے میں کامیاب نہیں ہوا۔ کسی کی تصویر میں نور اچھا جلوہ گر ہے۔ تو پرتو ندارد۔ اور کسی نقاش کی نظر پر تو پر جا پڑی ہے۔ تو نور نظر سے اُوجھل ہو گیا ہے۔ ہاں چشم بینا کے مطالعہ کے لئے نقاش ازل کے ہاتھ کی تحریر کے اوراق ہر وقت وا ہیں۔ آنکھ کو چاہیئے کہ کھل جائے۔ اور تماشہ دیکھے۔

چلئے۔ پہلے کسی دیسی عہدہ دار سرکاری کے مکان کی سیر کریں۔ ایک بڑی ڈیوڑھی سے گذر کر ایک وسیع صحن میں پہنچتے ہیں۔ صحن کے عین وسط میں ایک حوض ہے۔ جو پانی سے لبالب ہے۔ حوض کے چاروں طرف خوشنما گملے رکھے ہیں۔ کرسیاں بچھی ہوئی ہیں اور ہمارے معزز عہدہ دار سرکاری جو ایک آنی وضع کے بزرگ ہیں۔ کچہری سے آکر چغہ وغیرا اُتار کر ذرا سستا رہے ہیں فراش پیچھے ایک بڑا دستی پنکھا لئے کھڑا ہے۔ اور ہمارے معزز دست پیچوان کی چاندی کی سوہنال مُنہ میں لئے دھوئیں کے بادل نکال نکال کر اُن کی پیچ

دیرپیچ رفتار کا ایک مست نگاہی کے ساتھ لطف لے رہے ہیں۔گویا آرام و آسائش کی مورت ہیں۔اگر کوئی اجنبی اتنی ہی کیفیت کو دیکھے تو سمجھے کہ ہندوستان میں لوگ بڑے آرام سے زندگی بسر کرتے ہیں۔لیکن ذرا گستاخی سے نگاہِ تصور کو زنانے کی طرف لے چلئے۔اور نقشہ ملاحظہ کیجیئے۔کہ "گھر کے لوگ" کس حالت میں ہیں۔بیوی صاحبہ ہیں۔کہ چین جبیں ایک چارپائی پر متمکن ہیں۔چارپائی پہ ایک طرف کو ایک پاندان رکھا ہے۔جس کے باہر تک کتھے چونے کے دھبے ہیں۔اس کے پاس ایک بچے کا ٹوٹا سا کھلونا پڑا ہوا ہے۔پائنتی کی طرف کچھ ساگ پات دھرا ہے۔اور وہ ماما کو پکار رہی ہیں "ارے جلدی کھانے کی فکر کر۔ابھی میاں آتے ہونگے۔ذرا دیر ہو گئی۔تو میری جان کھا جائیں گے۔تیرا کیا جائے گا" اُدھر سے ماما بڑبڑاتی ہوئی آتی ہے "جب سے اِس گھر میں آئے ہیں۔نہ دن کو چین نہ رات کو آرام ہے۔سارا دن کام کاج میں کھپ جاتا ہے۔اور پھر بیوی کو دیکھو۔تو پیشانی سے بل ہی نہیں اُترتا" اور سامنے آکر پکار کے کہتی ہے "میاں تو آبھی گئے۔میں کون سی فارغ بیٹھی رہی کہ اِس سے پہلے کچھ فکر کرتی" اتنے میں ایک چھوٹی سی لڑکی باورچیخانہ کی طرف سے راکھ سے کھیلتی ہوئی آجاتی ہے۔اور اُسے دیکھ کر اُس کی ماں طیش میں آتی ہے "ابھی نگوڑی کو نہلا دھلا کر بھیجا تھا۔اور ابھی پھر لتھڑی ہوئی آگئی۔اب کہاں تک ان کو صاف رکھے۔اور وہ آئیں گے تو مجھے ڈانٹیں گے۔آپ ایک دن بھی خبرگیری کرنی پڑے۔تو معلوم ہو" اور لڑکی سے مخاطب ہو کر۔"اری چڑیل آ تو سہی تجھ سے سمجھوں گی۔اب کے باورچیخانہ میں جانا اگر دسپنا تجھ پر توڑ نہ دیا تو کہنا" یہ گھرکی سنتے ہی لڑکی بسورنے لگتی ہے۔اور اُس حالت میں ماں کے ماتھے پر بل پڑتے دیکھ کر پھوٹ پڑتی ہے۔اور چلا چلا کر رونے لگتی ہے۔رونے کی آواز مردانہ تک گئی۔اور ہمارے عہدہ دار صاحب چیخے "یہ کیا غل مچا رکھا ہے جب آؤ۔اِس گھر میں کچھ نہ کچھ شور ہی پاؤ گے۔جاؤ جمن (نوکر کا نام ہے) ذرا بیگ کے ننھی کو لے لینا" جمن آواز دیتا ہے۔اندر سے آواز آتی ہے "ٹھہرو۔ذرا اِس

کاٹنے دوڑتی ہیں"۔ مگر لڑکی بھاگ کر اسی طرح لٹھڑی ہوئی جمن کی گود میں آ جاتی ہے۔ اور وہ نامعقول بے سوچے سمجھے اُسے میاں کے سامنے لے آتا ہے لڑکی کی صورت دیکھتے ہی جھلاتے ہیں۔ اور غصّہ کے جوش میں بھرے ہوئے اندر جاتے ہیں "سارے دن بیٹھی ہوئی کیا کرتی رہتی ہو۔ کہ ذرا لڑکی کا دھیان نہیں رکھ سکتیں۔ لڑکے تو اب تمہارے محتاج نہیں۔ اُن کے لئے تو میاں جی نوکر ہے ہی بیچارہ اُنہیں کپڑے پہنائے۔ وہی سیر کو لے جائے۔ وہی سبق پڑھا چھوڑے۔ ایک لڑکی ہے۔ اُس کی طرف بھرے گھر میں کوئی توجہ کرنے والا نہیں" یہ عتاب سنتے ہی بھلا تاب کسے! بیوی بھی بگڑ کر جلے پھپھولے پھوڑنے لگتی ہے اگلے پچھلے گلے شکوے دفتروں کے دفتر کھل جاتے ہیں۔ اور آخر ایسی تلخی تک نوبت پہنچتی ہے کہ میاں کھانا کھائے بغیر شام کو پڑ رہتے ہیں۔ اور بیوی الگ مُنہ لپیٹ کر اپنے بڑوں کو کوستی ہے۔ کہ ایسے سخت گیر خاوند سے بیاہ دیا۔ کہ عمر رونے میں کٹ گئی۔

اب یہاں زیادہ ٹھہرنے کی ضرورت نہیں۔ انہیں کے ہمسائے میں ایک اَور معزز عہدہ دار رہتے ہیں۔ مگر وُہ نئے رنگ کے آدمی ہیں۔ ذرا اُن کے ہاں ہوتے چلیں۔ ایک مکلّف نشست ہے۔ جس کے دروازے پر چلمنیں پڑی ہیں اندر پردے لٹک رہے ہیں۔ کمرے کی آرائش میں انگریزیت کی صاف جھلک نظر آ رہی ہے۔ اَور معلوم ہوتا ہے۔ کہ مکان کے سجانے کا یہ نقشہ ضرور کہیں سے اُڑایا ہوا ہے۔ کچھ کرسیاں قرینے سے دھری ہیں۔ کونے میں ایک میز رکھی ہے۔ جس پر شیشہ۔ کنگھی۔ انگریزی خوشبودار تیل۔ بال سنوارنے کا برش سب سامان درست ہے۔ وسط پر ایک میز ہے۔ جس پر چند نہایت عمدہ جلدوں کی کتابیں ہیں اُن میں بعض تصویروں کے البم ہیں بعض عمارات اور مشہور مقامات کے نقشے ہیں ایک آدھ دلچسپ ناول ہے۔ ایک کسی مشہور سیاح کا سفرنامہ ہے غرض ہر چیز سے صاحب خانہ کی تربیت۔ سلیقہ شعاری اَور صفائی مذاق کا پتہ چلتا ہے

اتنے میں دو صاحب نئی وضع کے لباس میں ملبوس۔ کمرے میں باتیں کہتے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔ اُن میں سے ایک تو صاحب خانہ ہیں۔ اور دُوسرے اُن کے ایک دوست ہیں۔ جو نئے تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ اصلاح ملک و قوم کی فکر میں اکثر مبتلا رہتے ہیں۔ اور کبھی کبھی اپنی خوش تقریری سے بھی کام لیتے ہیں۔ اور اپنے خیالات کا اثر لوگوں کے دِلوں پر ڈالنا چاہتے ہیں۔ ذرا اُن کی گفتگو سُن لیجئے۔

صاحب خانہ۔ اب کے آپ بہت دنوں میں تشریف لائے۔ آپ کے دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں۔ جب آپ کو دیکھتا ہوں۔ دِل خوش ہو جاتا ہے۔ قومی کاموں میں آپ کی طرح دلسوزی کرنے والے ہم لوگوں میں ابھی بہت کم ہیں۔

مصلح۔ جناب۔ یہ سب آپ کی قدردانی ہے۔ ورنہ میں کیا اور میری خدمت کیا۔ واللہ۔ اگر آپ جیسے قدردان نہ ہوں۔ تو اس ملک میں دم گھٹ جائے ملک کے واسطے آپ کوئی کام کیجئے۔ اہل ملک آپ سے بدظن ہو جائیں گے۔ اور داد کی بجائے اعتراضوں کی بوچھاڑ کریں گے۔ اب اِسی عورتوں کی اصلاح کے مسئلہ کو دیکھئے جس سے مجھے دلچسپی ہے۔ کیسا ضرُوری معاملہ ہے۔ اور لوگ اُس سے کس قدر غافل ہیں۔ اور تو اور۔ جو نیک صلاح دے۔ اُلٹے اُس کے سر ہوتے ہیں۔

صاحب خانہ۔ واقعی جس استقلال سے آپ ان فتنوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ آپ ہی کا کام ہے۔ فرمائیے اب کچھ عرصے سے کوئی لکچر آپ نے نہیں دیا۔

مصلح جناب مجمع ہی نہیں ہوتا۔ آپ کا شہر ایسے بے مذاق آدمیوں سے بھرا ہوا ہے۔ ورنہ بندہ تو ہر وقت حاضر ہے۔ اب بیوہوں کے لئے ایک جلسہ قرار پایا ہے اُسی کے اہتمام میں جاتا ہوں۔ اور آپ سے مرخص ہوتا ہوں آپ بھی قدم رنجہ فرمائیے گا۔

غرض صاحب خانہ سے وعدہ لے کر وہ تو رخصت ہوئے۔ اور صاحب

خانہ اندر تشریف لے گئے۔ گوشش زدہ اثرے دارد۔ ابھی ابھی عورتوں کی اصلاح کا ذکر تھا۔ بیوی سے اُسی کے متعلق گفتگو شروع ہوئی۔

میاں۔ میں نے کئی دفعہ تم سے کہا ہے۔ کہ ابھی موقعہ ہے۔ کچھ شد بُد لکھنا پڑھنا سیکھ لو۔ واقعی جب کبھی باہر لکھی پڑھی عورتوں کا ذکر ہوتا ہے۔ تو مجھے سخت ندامت ہوتی ہے۔ اور میں تو اسی خیال سے تعلیم نسواں کی حمایت میں کچھ کہنے سے شرماتا ہوں۔ کہ میرے اپنے گھر میں پڑھی ہوئی بیوی نہیں ہیں۔

بیوی۔ یہ کیا آپ کو دھن لگی ہوئی ہے۔ کیا سارے زمانہ کی عورتیں پڑھی ہوئی ہوتی ہیں۔ ہمارے تو کنبے بھر میں کبھی لکھنے پڑھنے کا چرچا نہیں ہوا۔ کسی کو بہت خیال ہوا۔ تو قرآن مجید ناظرہ پڑھنا سیکھ لیا۔ کہ چلو ثواب کا کام ہے۔ یہ ایک نئی علّت لگی کہ پڑھے بغیر گذارہ ہی نہ ہو۔

میاں۔ گذارے کی تو بات ہی الگ ہے۔ اب ہم زندگی بھگت ہی رہے ہیں مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ بغیر خواندہ بیوی کے زندگی بے لطف ہے۔

بیوی۔ (اچانک بگڑ کر) تو کوئی خواندہ ڈھونڈی ہوتی۔ میری تو ماں کی آنکھوں پر تمہارے ہاں کی روٹی رزق دیکھ کر پٹی ہی بندھ گئی۔ کہ اُس نے مجھے یہاں جھونک دیا۔ ہر وقت پڑھائی کا طعنہ۔ ہر وقت پڑھنے کا جھگڑا۔ اور کوئی بات ہی نہیں۔ بس یہی ایک چھیڑ ہاتھ لگ گئی۔ اب کوئی اور خواندہ کر لاؤ۔ ہم سے بھی جیسے ہو گا زندگی کاٹ لیں گے (اور بلند آواز کر کے) آگ لگے ایسی روٹی کو۔ چولھے میں جائے ایسا رزق!! (رونے کی آواز آنے لگتی ہے)

میاں بیچارے سلیم الطبع آدمی۔ دم بخود۔ خواہ مخواہ امنِ خانگی میں خلل اندازی پہ پچھتاتے۔ کچھ اپنی تعلیم کو کچھ اپنی قسمت کو کوستے باہر نکل آتے ہیں۔ اور دل ہی دل میں کڑھتے ہوئے خدا سے شکایت کرتے ہیں۔ کہ یا تو اس ضرورت کا احساس نہ دیا ہوتا۔ یا والدین کے دل میں بھی جن کے ہاتھ میں اولاد کی مناکحت کی باگ ہوتی ہے۔ اس ضرورت کا احساس ڈال دیا ہوتا۔

خرم آنکس کہ از جہاں بے خبر است ہوش است کہ سرمایۂ صد دردسر است
ہر چند کہ بیضہ از قفس تنگ تر است در بیضہ نمے کنند مرغاں فریاد

اب ذرا قومی مصلح کا تعاقب کیجیئے۔ دوست کی ملاقات سے فارغ ہو کر ایک چھاپہ خانہ میں پہنچے۔ وہاں اسی طرح ناقدر دانی زمانہ کے دُکھڑے روئے اور کہا۔ کہ خیر

کس بشنود یا نشنود من گفتگوئے میکنم

بلا سے لوگ نہ مانیں۔ ہم تو اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں گے۔ ایک اشتہار لکچر کا پرسوں کے لئے چھاپ دیجیئے۔ لکچر کا موضوع یہ ہو "مردوں اور عورتوں کے حقوق مساوی ہیں" موضوع کا اظہار کرنے پر دیر تک صاحب مطبع سے اس اصول پر بحث رہی۔ حضرت مصلح نے بڑے شد و مد سے اس اصول کو ثابت کیا اور کہا۔ کہ مرد عورتوں پر اس ملک میں بڑا ظلم کرتے ہیں۔ اور اُن کے حقوق غصب کئے بیٹھے ہیں۔ اُن کو خدا کے روبرو جواب دینا ہوگا۔ اس گفتگو سے فارغ ہو کر گھر پہنچے۔ ایک پُرانے سے گھر میں جس میں کھاٹ کھٹولے تک درست نہیں۔ ایک دالان میں جہاں باوجود شام ہو جانے کے چراغ تک نہیں جلا تھا ایک بیکس سی عورت لیٹی تھی۔ یہ ہمارے لکچرار صاحب کی اہلیہ تھی لکچرار صاحب نے اُسے کس مپرسی کی حالت میں پڑا رہنے دیا۔ اُس کو کچھ پُوچھا تک نہیں۔ اَور آپ الگ صحن میں ایک ٹوٹی سی چارپائی پر دراز ہو گئے۔ وہ نیک بخت اُٹھی۔ اور پنکھا لے کر جھلنے لگی۔ وہ کھڑی پنکھا ہلاتی رہی۔ ہمارے انصاف پسند دوست کے مُنہ سے یہ نہیں نکلا۔ کہ بیٹھ جاؤ۔ نہ کوئی شکریئے کا کلمہ نکلا۔ کچھ دیر کے بعد بغیر کسی خطاب کہنے کے پوچھا" کھانا تیار ہے؟" وہ دوڑی اَور کھانا نکال لائی۔ پاس بیٹھ کر کھلانے لگی۔ جو کچھ پکا تھا۔ اس نیک اَور ایثار کرنے والی بیوی نے خاوند کے آگے لا کر رکھ دیا۔ اَور جو کچھ اُس نے کھانے کے بعد چھوڑا۔ اُس سے اپنا پیٹ بھر لیا۔ معلوم نہیں۔ ہمارے لکچرار کے دِل میں ایک لمحے کے لئے بھی

یہ خیال آیا یا نہیں کہ اُن کے گھر میں زن و مرد کے حقوق کی مساوات کہاں تک ملحوظ ہے۔ لیکن اگر آیا بھی ہوگا۔ تو انہوں نے یہ من سمجھوتہ کر لیا ہوگا کہ اگر عورت بھی پڑھی لکھی ہو۔ تو اُس کے حقوق اُن کے ساتھ برابر ہوں۔

چلئے ان کے حال سے در گذر کر کے اِن کے ایک پڑوسی بابو صاحب ہیں اُن کی خانہ داری کا اندازہ کرتے چلیں۔ بابو صاحب کہیں باہر گئے ہیں۔ اُن کی غیر حاضری میں بام خانہ پر ایک عورت چھڑکاؤ کر رہی ہے۔ ایک چارپائی پر بچھونا بچھا ہے۔ اِس کے پاس اسی عورت نے حقّہ بھر کر رکھ دیا ہے۔ اُس عورت کی پوشاک یہ ہے۔ کہ ایک میلا سا کپڑا ہے۔ جسے سر سے پاؤں تک ساڑھی کے طور پر اوڑھے ہوئے ہے۔ مگر وہ ستر میں کچھ بہت مدد نہیں دیتا۔ شاید خیال گذرے۔ کہ یہ کوئی خادمہ ہے۔ مگر نہیں۔ یہ بابو صاحب کی بیوی ہے۔ جو آپ تو روز دُھلے ہوئے کپڑے بدلتے ہیں۔ اور ہم چشموں میں خوش خوراور خوش پوش مشہور ہیں۔ یہ بھی اچھے اچھے کپڑے رکھتی ہے۔ جنکی زرق برق سے آنکھیں چکا چوند ہو جائیں۔ مگر وہ تو تیوہار یا میلے پر جانے یا شادی بیاہ میں شریک ہونے کے موقعوں پر نکالے جانے کے لئے صندوقوں میں احتیاط سے بند ہیں۔ اِس کے علاؤہ اُس کے پاس بھاری بھاری زیورات ہیں۔ جن پر اُسے ناز ہے۔ مگر اُن کو بھی خاص موقعوں پر ہی نکالتی ہے۔

اسی مکان کے سامنے جولاہوں کا ایک گھر ہے۔ اس میں ایک بڈھا دیرینہ سال جولاہا بیٹھا حقّہ پی رہا ہے۔ آؤ آج کے مشاہدات کے ختم کرنے سے پہلے اس کی باتیں سن لیں۔ ویسے تو آپ جس دن آئینگے۔ اور جتنی مرتبہ آئینگے ہندوستان کی زندگی کی تصویر کے دو نو رُخوں کا منظر آپ کو نئے سے نئے رنگ دکھلائے گا یہ بڑے میاں گذشتہ زمانے کی خوبیوں کا بیان کر رہے ہیں۔

آپ۔ کہو بڑے میاں۔ آج کل کے زمانے کے بڑے شاکی معلوم ہوتے ہو۔

بڈھا۔ کچھ پوچھیئے نہیں۔ زمانہ کہے سے ایسا نکل گیا ہے۔ کہ کوئی حد نہیں۔

خدا جانے کیا اندھیر ہونے والا ہے۔ عورتوں کی کبھی ایسی آزادی نہ دیکھی نہ سُنی یقین جانیئے۔ عمر کی ماں کو بیٹے کا نام ہے ایں رہتے وُہ وُہ پیٹا ہے کہ بیچاری نے کبھی یہ نہیں کہا۔ کہ میں تمہارے گھر نہیں رہتی۔ مگر اس عمر نالائق نے میرے گھر کا ستیاناس کر دیا ہے۔ اپنی عورت کو اس قدر سر چڑھا رکھا ہے۔ کہ خدا کی پناہ۔ ہمارا ابھی جوانی میں بیاہ ہوا تھا۔ ہم تو اپنے باپ کے سامنے عورت کی اتنی پاسداری نہیں کرتے تھے۔ خواہ وُہ اسے جھڑک دیں۔ خواہ وہ زیادہ کام لیں خواہ کم۔ خواہ تھوڑا کھانے کو دیں خواہ بہت۔ یہ نابنجار جس دن سے بیاہا گیا ہے۔ مجھے باپ ہی نہیں سمجھتا۔ اور وہ نامراد ناشاد ساس سے یوں لڑتی ہے۔ جیسے سوت ہو۔ میں نے بار ہا لڑکے کو سمجھایا۔ تو آج آخر اُس نے ذرا ہاتھ اُٹھایا تھا۔ مگر صاحب وُہ بگڑی ہوئی عورت۔ ابھی دو چار ہی پڑی تھیں۔ کہ محلہ سر پر اُٹھا لیا۔ اور اُس وقت سے رو رہی ہے۔ کہ میں تو طلاق ہی لوں گی۔ عجب مصیبت میں جان ہے۔ اُدھر یہ بے عقل پھر موم ہوا جاتا ہے۔ کہتا ہے۔ عورت ہاتھ سے جائے گی۔ حالانکہ میں اُسے کہہ چکا ہوں۔ کہ عورت کو جوتی برابر سمجھنا چاہیئے۔ ایک اُتر گئی۔ دوسری پہن لی۔

بڑے میاں کے خیالات کا نمونہ تو آپ نے سُن لیا۔ چلو اب چل کے سو رہیئے خدا کرے۔ خواب میں آپ کو تصویر کا سیاہ رُخ کسی قدر سفیدی سے بدلتا نظر آئے۔ تو صبح کو ہم آپ کو کوئی اچھی سی تعبیر بتائیں۔

ناکتخدا لڑکی

اے معزز خاندان کی کمسن پیاری لڑکی تیرے خوبصورت چہرہ سے عالی خاندانی کے اثر نمایاں ہیں۔ شریف والدین کے تعلیمی اثر نے تجھے چھوٹی سی عمر میں بردبار اور متین بنا دیا ہے۔ لیکن تقاضائے عمر کی بے چینیاں تیری صورت سے ٹپک رہی ہیں۔ تیری بھولی بھالی باتیں بتا رہی ہیں۔ کہ بام عمر کی صرف دسویں سیڑھی تک تیرا قدم پہنچا ہے۔ بس اب دو تین زینوں پر قدم رکھنے کے بعد تیری زندگی کا ایک نیا مرحلہ شروع ہوگا۔ کیا تجھے یہ لاابالی زمانہ یاد رہے گا نہیں۔ پھر تو کسی اور دنیا میں چلی جاوے گی۔ تیرے اس مکان کی چار دیواری جو اسوقت تیری دنیا ہے۔ اور تیرے مکان کی چند گز زمین جو تیری سیر گاہ ہے۔ پھر اسے کہاں پائے گی۔ اے عیش و آرام کی گودیوں میں پلی ہوئی دوشیزہ لڑکی۔ خدا کرے۔ تو جیسی خوبصورت ہے۔ ویسی خوش نصیب بھی ہو۔ تیرا نیک شوہر کسی شریف خاندان کا سید اور تعلیم یافتہ نوجوان ہو۔ اور یہ خدا کی دی ہوئی نعمت تیرے لئے سرمایۂ ناز ہو۔ تو اپنے ہمجنسوں میں فخر و مباہات کرے۔ اور وہ تیری عصمت اور سلیقہ شعاری کا قدردان ہو۔ بھولی ناسمجھ لڑکی! ابھی تو تو گڑیوں سے کھیل رہی ہے۔ انہیں سے تیرا دل بہلتا ہے۔ اور انہیں کو تو پیار کرتی ہے۔ ان ہی کو تو اپنے ہاتھ سے سی سی کر عمدہ کپڑے پہناتی ہے اور انہی کو تو اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے گھروندے یا طاق میں بٹھا کر اپنی صناعی کا تماشہ دیکھتی ہے۔ اور دل ہی دل میں شاد ہوتی ہے۔ اللہ اللہ تو اس عالم کے مزے لوٹ رہی ہے جس کو دنیا اور افکار دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ تیرا چھوٹا بھائی تجھ کو ستانے کے لئے تیری گڑیوں کو تتر بتر کر دیتا ہے اور انہیں نوچ کھسوٹ ڈالتا ہے۔ تو تو کبھی رونے لگتی ہے۔ کبھی

فریاد کرتی ہے۔ کبھی اُس شوخ لڑکے کو کوستی ہے۔ اور اگر زیادہ غصہ آتا ہے۔ تو اُس کے دونو ہاتھ پکڑ کر زمین پر گرا دیتی ہے۔ وہ چالاک لڑکا کیا صفائی سے ہاتھ چھڑا کر نکل جاتا ہے۔ اور تو مُنہ دیکھ کر رہ جاتی ہے۔ پھر تو آنسو پونچھ کر اپنی چیزوں کو ٹھکانے سے رکھتی ہے۔ پیاری زہرہ! (ہاں یہی تیرا نام ہے) جب تو نے اپنے ہمسائے کی لڑکی رشیدہ سے اپنے گڑیا کی شادی کی اور تیری ساری سہیلیوں نے خدائی رات میں ڈھول بجا بجا کر شادیانے گائے۔ کیا اُس وقت تجھے یہ خیال آیا تھا۔ کہ تیرا دولھا بھی آخر کوئی ہوگا۔ جو کسی روز اس گڑیا کی طرح تجھے بھی بیاہ لیجائیگا۔ جس کو تو نے بنا سنوار کر بٹھایا ہے۔ نہیں تجھے یہ خیال کیوں آنے لگا۔ شرافت کا خون جو تیری رگوں میں شرم وحیا بن کر دورہ کر رہا ہے۔ وہ ایسے معاملوں کی طرف تیرے ذہن کو منتقل ہونے نہ دیگا۔ تیری بھولی صورت کہہ رہی ہے کہ تو شرم والی لڑکی ہے۔ تو میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ تیری چھوٹی سی چوٹی جو شفیق ماں نے اپنے ہاتھ سے گوندھ دی ہے۔ اُس کو بھی تیری بے پرواہی سنبھال نہیں سکتی۔ آگے چھوٹے چھوٹے بال چوٹی سے کھل کر لچھے دار ہو گئے ہیں۔ اور چاند سی پیشانی پر لہرا رہے ہیں۔ تو گھبرا گھبرا کر اُن کو پیشانی سے ہٹاتی ہے۔ مگر وہ حسین چہرے کی بلائیں لینے کو جھکے پڑتے ہیں۔ ظاہری نمائش اور مصنوعی آرائش سے تیری مستغنی طبیعت کو کس قدر نفرت ہے۔ قدرت کے پاک ہاتھوں کی بنائی ہوئی تصویر عصمت کا فرشتہ تجھ کو اپنے پروں میں چھپائے ہوئے ہے۔ کہ تیرے حسن خداداد کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ بے مسّی کے چمکتے ہوئے خوشنما دانتوں کا سلسلۂ سلک مروارید شرما رہا ہے۔ بغیر کاجل کے شرم وحیا بھری ہوئی آنکھوں کا جادو مہربان والدین کا دل لبھا رہا ہے۔ مگر ہاں اے نیک بخت زہرہ! آج تیری ماں کے کلیجہ میں پنکھے کیوں لگے ہیں؟ تو اپنی ہم عمر سہیلیوں کے ساتھ ہنڈ کلھیا پکا رہی ہے۔ اور وہاں گھر کے بڑے بوڑھوں میں سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔

ناسمجھ لڑکی! تو جس گھر میں پلی ہے۔ اُس کے در و دیوار پہ اک حسرت

بھری نظر ڈال کے الوداع کہہ لے اور اپنی پیاری پیاری گڑیوں سے بھی رخصت ہولے۔ اب تو ان سے چھوٹ جائے گی۔ اور دنیاداری کے کام تیرے گلے پڑیں گے تجھے ایک نئے گھر میں جانا ہے جہاں کا آسمان و زمین بھی تیرے لئے بیگانہ ہے۔ نئے نئے لوگ ہوں گے نئی نئی صورتیں دیکھنے میں آئینگی تو اپنے گھونگھٹ کے اندر رہی اندر حسرت بھری نظریں دوڑائے گی مگر تیری پیاری سہیلیاں تجھے نظر نہ آئیں گی۔ بہت دن تیرا دم گھبرائے گا۔ جس نے تجھے اپنی گود میں پالا جس نے تیری ضد پوری کرنے کے لئے ہزار ہا مصیبتیں جھیلیں۔ وہ عاشق زار ماں چھوٹ جائے گی تیرے چاہنے والے رضینا بامراللہ کہہ کر تجھے اک ایسے اجنبی کے سپرد کر دیں گے کہ جس کی صورت بھی آج کے سوا تو نے کبھی نہ دیکھی ہو گی۔ اب وہ ہمیشہ کے لئے تیرا چاہنے والا دولہا تیری نیک مزاجی اور سلیقہ شعاری کا قدردان ہوگا تیری ماں نے اپنے کلیجے پر پتھر رکھ لیا تو ایک غیر شخص مگر وارث شرعی کے پہلو میں ہے۔ اپنے بھولے چہرے سے ہاتھ اُٹھا کر دیکھ۔ اُس کی مانوس نگاہیں محبت میں ڈوبی ہوئی تیرے دریائے حسن کی موجوں میں غوطہ کھا رہی ہیں۔ کیا تو اس بات سے خوش ہے کہ اک حسین نوجوان کے پہلو میں بیٹھی رہے ؟ نہیں تو ابھی خوش نہیں۔ مگر آئندہ خوشی کی اُمید رکھ۔ ناسمجھ لڑکی تیرے آنسو کیوں ڈبڈبائے ہوئے ہیں۔ تو ہچکیاں لے لے کر کیوں رو رہی ہے۔ اب اپنا گھر کیوں یاد کرتی ہے آنکھیں کھول اور دیکھ کہ اب یہی ہمیشہ کے لئے تیرا گھر ہے۔ اور یہ اجنبی ان تیرا شوہر ہے زہرا! اپنے متصل گریہ کو روک کہ ہچکی تھمے۔ دلکو ٹھہرا۔ اور سن۔ دکھیا ماں تجھے دعا دیتی ہے اور تجھ سے رخصت ہوتی ہے۔ میری پیاری بچی۔ میری نادان زہرہ خدا تیرے خاوند کو نیک ہدایت دے وہ تیرا تلوا دیکھ کر کسی کا منہ نہ دیکھے تیرا گھر آباد رہے تو پھلے پھولے سات بچوں کی ماں ہو۔

منشی مہدی حسن احسن لکھنوی

ناکام محبت

ایک روز کا ذکر ہے میں ٹہلتا ٹہلتا دیہات کی طرف جا نکلا۔ چونکہ بہت دور نکل آیا تھا واپس ہوا تو دم لینے کے لئے راستے میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ دور سے ایک جنازہ آتا دکھائی دیا۔ نزدیک آیا تو معلوم ہوا کہ کچھ نوجوان لڑکیاں ایک تابوت کو اُٹھائے ہیں اور ایک جو اُن سب سے کسی قدر بڑی عمر کی ہے تابوت کے آگے آگے سفید پھولوں کا ایک ہار ہاتھ میں لئے آرہی ہے پوشاک اِن سب نازنینوں کی سفید رنگ کی تھی۔ تابوت کے پیچھے پیچھے متوفی کے والدین تھے۔ جن کی وضع سے ظاہر تھا کہ کوئی اچھے خوشحال کسان ہیں۔ باپ کے چہرے سے صبرو استقلال عیاں تھا۔ مگر جھی ہوئی نظر چڑھی ہوئی تیوری اور جھرّیوں دار چہرہ بتا رہا تھا کہ اندر دل کی حالت کچھ اور ہے ماں اپنے خاوند کے بازو پر جھکی تھی اور رہ رہ کر بیتاب ہوتی تھی میں جنازے کے ساتھ ہو لیا اور دفن کے بعد تک لوگوں کے ساتھ رہا۔ جب تابوت کو قبر میں اُتارا ہے سہیلیاں پھوٹ پھوٹ کر روتی تھیں۔ باپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اور ماں کا یہ حال تھا کہ کوئی تسلی دیتا تھا تو اور بے چین ہوتی تھی افسوس جس ماں کا گل گلزار خوبی عین بہار میں یکایک یوں پژمردہ ہو کر رہ جائے وہ اگر یہ بھی نہ کرے تو اور کیا کرے!

قبرستان سے واپس ہو کر میں نے سارا حال معلوم کر لیا۔ اور معلوم کرنے کو کیا ایک نہایت سادہ کہانی تھی۔ متوفی گاؤں کے ممتاز حسین اور سارے کسانوں کی لاڈلی نوجوان لڑکی تھی۔ یہ اپنے ماں باپ کی اخیر عمر کی ایک ہی بچی تھی اور دیہات کی سیدھی سادی معاشرت میں بڑے نازوں سے پل کر جوان ہوئی

تھی تعلیم اپنے گاؤں کے پادری سے پائی تھی اور وہ اس پر بے حد شفقت کیا کرتا تھا۔ اس کا نازک ڈیل ڈول دلفریب خدوخال البیلا حسن خداداد دلربا بھولا پن غضب کا الھڑپن اور بے حد نیک دل یہ کہتا تھا کہ کھیت کے مضبوط مضبوط درختوں میں حسن اتفاق سے باغ کا ایک نازک نونہال پھلنے پھولنے کو آپڑا ہے سہیلیاں اُس کے حُسن کی برتری کو تسلیم کرتی تھیں۔ مگر حسد نہ کرتی تھیں اس کی بلا تصنع نرم مزاجی اور دلربا خوش اطواری ایسی تھی کہ یہ خیال ناممکن کیسا محال محض تھا۔ دیہات کا کون سا تہوار تھا جس میں ہماری خوبصورت کسان کی لڑکی اپنی سہیلیوں سمیت شریک نہ ہوتی تھی۔ کون سی خوشی کی تقریب تھی جس میں اس کے قدم میمنت لزوم سے لطف دوبالا نہ ہو جاتا تھا۔ ہرے بھرے جنگل میں جھولے ڈالے جاتے تھے۔ پھول پہنے جاتے تھے۔ لٹائے جاتے تھے اور ہزاروں طرح کے دل بہلاوے ہوتے تھے۔ یہ میلے گاؤں میں اکثر رہا کرتے تھے اور ان موقعوں پر کبھی کبھی شہر کے رہنے والے بھی تماشا دیکھنے کو آنکلتے تھے۔ ایک دفعہ ایسے ہی موقع پر سپاہیوں کا ایک دستہ گاؤں کے قرب و جوار میں آکر ٹھہرا۔ بہت سے سپاہی تماشا دیکھنے کو آئے۔ ان میں ایک نوجوان افسر بھی تھا اُس پر اس گاؤں کی رہنے والی ملکۂ حسن و جمال مرجع خاص و عام کا ایسا اثر ہوا کہ بیدھڑک اظہار محبت کرنے لگا۔ اُس کے محبت بھرے جملوں الفت کی نظروں پیار کے لہجوں اور سینکڑوں مایہم اور دل پسند حرکات و سکنات نے اس ننھے نازک بھولے بھالے دل کو چٹکیوں میں موہ لیا۔ اس کے دل میں نوجوان سپاہی کی محبت روز بروز بڑھتی جاتی تھی مگر اُسے معلوم نہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور آخر کیا ہوگا۔ اسے آئندہ کا خیال تک نہ تھا۔ اس کا منظور نظر جب پاس ہوتا تو یہ اس کی باتوں اس کی حرکات و سکنات میں محو رہا کرتی اور وہ پاس نہ ہوتا تو یہ ایام گذشتہ کے شیریں واقعات کو یاد کرکے جی بہلایا کرتی۔ افوہ! اس لڑکی کو اپنے محبوب سے کتنی محبت

تھی! نوجوان سپاہی کی سپاہیانہ خوب صورت وضع نے اس پر جادو کر دیا تھا اور اس کے دل کو چھین لیا تھا یہ گو یا اُس کی پرستش کرتی تھی اور اسے ہمیشہ اپنے سے اعلیٰ و برتر سمجھتی تھی۔ یہ بات نہیں کہ اِس پر دولت اور رتبے کا اثر پڑتا تھا۔ ہرگز نہیں۔ وہ تو عقل و تمیز، سلیقہ و شعور تھا جس کے باعث نوجوان سپاہی نے اس کے دل پر قبضہ کیا تھا۔ یہ ہمہ تن گوش ہو کر اُس کی باتیں سُنا کرتی تھی اور بے انتہا مسرت کے ساتھ اس کی طرف دیکھا کرتی تھی۔ اور جب کبھی اس اثنا میں اپنا خیال آجاتا تھا تو آپ کو بہت کم درجہ پا کر ایک ادائے دلبرایانہ کے ساتھ جھینپ جاتی تھی اس کے عاشق کو اس سے محبت تو بڑی تھی لیکن اس قدر نہ تھی جس قدر اس کو تھی۔ اُس نے اگرچہ کھیل ہی کھیل میں اس سے تعلق پیدا کیا تھا تاہم وہ ایسا آوارہ و اوباش نہ تھا کہ کچھ بھی پروا نہ کرتا۔ وہ اس محبت کرنے والی کے اطوار۔ طرز معاشرت اور حیا و عصمت کو دیکھتا تھا تو بے اختیار شادی کی تمنّا اُس کے دل میں موجزن ہوتی تھی مگر پھر اُس کا اعزاز ظاہری خاندانی مرتبہ اور باپ کی مغرور اور پُر تمکین طبیعت یہ سب ایسی رکاوٹیں تھیں کہ اس کا دل ٹوٹ جاتا تھا۔

یکایک رسالے کے کوچ کا حکم ہوا اور اس نے ہمارے نوجوان کی آرزوں کا یکلخت خون کر دیا۔ نوجوان نے چاہا کہ اپنی محبوبہ کے نازک دل کو اِس وحشتناک خبر سے صدمہ نہ پہنچائے۔ اسی لئے جب چلنے میں ایک دن رہا تو مجبوراً شام کو سیر کرتے ہوئے اُس نے ذکر کیا۔ اس معصومہ کو جدائی کا کبھی خیال بھی نہ آیا تھا خبر کیا تھی ایک برق بلا تھی کہ خرمن مسرّت اور راحت کو دم بھر میں خاک سیاہ کر گئی نازنین زار زار مثل ابرِ نو بہار رونے لگی۔ عاشق صادق نے فرطِ محبت میں سینے سے لپٹا لیا نازک گلابی رخساروں کو چوما اور یہاں تک کہا کہ آؤ گھر چھوڑ دو اور جہاں خدا لے جائے ساتھ چلی چلو۔ یہ اس قدر سادہ لوح تھی کہ سراسیمہ ہو کر اُس کی طرف دیکھنے لگی اور جب ذرا دیر کے بعد مطلب سمجھی

تو عجیب کیفیت ہوئی۔ زبان سے تو کچھ نہ کہا مگر اس طرح پیچھے ہٹی جس طرح کوئی افعی سے بچتا ہے اور ایسی درد بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا کہ نگاہ سینے کو چیر کر دل کے پار ہو گئی۔ پھر کلیجہ مسوس کر باپ کی جھونپڑی کی طرف بھاگی۔ غریب سپاہی ہکا بکا خفیف ہو کر رہ گیا۔

اگلے ہی دن رسالے کے ساتھ وہ اُس گاؤں سے چلا گیا۔ نئے آب و دانے نئے نئے منظروں نئی نئی تفریحوں اور نئے نئے رفیقوں نے اُس کی محبّت کو بھلا سا دیا۔ تاہم خیمہ گاہ کی چہل پہل۔ زمانِ محاصرہ کی تفریح۔ فوجوں کی صف آرائی اور لڑائیوں کے شور و غل میں کبھی کبھی اسے دیہاتی پر امن اور سادہ زندگی کے نظارے یاد آجاتے تھے۔ ہائے وہ سفید جھونپڑی! وہ ٹپیا جو روپہلے نالے کے کنارے ہو کر اوپر جھاڑی تک پہنچی تھی! وہ ننھی منی دیہاتی لڑکی جو اُس کے بازو کے سہارے اُس ٹپیا پر ادھر اُدھر ٹہلا کرتی تھی اور بے حد تمنا کے ساتھ اس کی باتیں سُنا کرتی تھی!

محبوب کی جدائی سے بے چاری دہقان زادی کو بڑا بھاری صدمہ ہوا۔ اُس کی اُمیدیں خاک میں مل گئیں۔ پہلے کچھ دنوں تک تو غش آتے رہتے اور دیوانہ پن کے آثار پائے گئے۔ جب یہ شکایتیں دور ہوئیں تو ایک گہری تاریک غم کی گھٹا دل پر چھا گئی جس سے تھوڑے ہی عرصے میں جسم نازنین کا سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ آہ! اس نے جھروکے سے سپاہیوں کو کوچ کرتے دیکھا تھا۔ اس نے اپنے بیوفا عاشق کو دور تک اس وقت تک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا کہ ڈھیلوں میں درد ہونے لگا تھا۔ دور سے اب فقط ایک چمکتا تارا سا نظر آتا تھا! ہائے ایک خوابِ روشن تھا کہ آنکھوں سے نہاں ہو گیا اور اسے تاریکی میں چھوڑ گیا! لوگوں سے اسے نفرت ہو گئی۔ اکیلی اُن روشوں پر ٹہلا کرتی تھی جن پر یہ اور اُس کا محبوب دونوں اکثر رہا کرتے تھے۔

بس جس طرح کوئی آہوئے زخم خوردہ سب کی نظروں سے پنہاں ہو کر

کسی گوشے میں رو رو کر جان کھویا کرتا ہے۔ یہی ہو بہو اس کی حالت تھی۔ شام کے وقت گوالنیں اپنے اپنے کھیتوں سے آتی تھیں تو اکثر اسے کوئی غمناک گیت گنگناتے سُنتی تھیں۔ عبادت کی طرف اب اس کا میلان بہت زیادہ ہوگیا جب پاس سے گذرتی تھی تو بڑھے بوڑھے بھی اس کی ناتوانی ولاغری پر ترس کھا کر اور اس کی زاہدانہ صورت سے مرعوب ہو کر راستے سے ہٹ جاتے تھے۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ میں قبر کی طرف قدم بڑھائے جا رہی ہوں۔ مگر قبر کا خیال اُسے تشویش میں نہ ڈالتا تھا۔ یہ تو اسے آرامگاہ سمجھتی تھی جس رشتہ سیمین نے اسے دنیا سے باندھ رکھا تھا وہ ٹوٹ گیا تھا دنیا کی کوئی خوشی اسے خوشی نظر نہ آتی تھی۔ سخت مجبور ہو کر اس نے اپنے محبوب کو ایک آخری خط لکھا اس میں یہ بیان کیا کہ میں جاں بلب ہوں اور یہ سب تمہاری کرتوت ہیں اس خط میں اپنے تمام رنج والم بھی تحریر کئے اور اخیر میں یہ لکھا کہ میرے جی نے گوارا نہ کیا کہ تمہیں معاف کئے بغیر مر جاؤں۔

بالآخر نقاہت اتنی بڑھی کہ جھونپڑی سے باہر نکلنا محال ہوگیا۔ گر پڑ کر جھونپڑے تک پہنچ جاتی تھی اور وہیں بیٹھی بیٹھی دن گذار دیتی تھی۔ اُس نے کبھی کسی کا گلہ نہ کیا۔ محبوب کا نام تک کبھی اُس کی زبان سے نہ نکلا۔ ماں کے سینے پر گردن ڈال دیتی تھی اور چپکی چپکی روتی تھی۔ غریب والدین بیٹی کا یہ حال دیکھ دیکھ کر کڑھتے تھے مگر مایوس نہ ہوتے تھے۔ ابھی ان کو امید تھی کہ ہمارے خزاں رسیدہ نونہال پر پھر ایک دن بہار آئے گی۔

ایک دن اسی صورت سے وہ اپنے والدین کے پاس بیٹھی تھی۔ دونو ہاتھ اُن کے ہاتھوں میں تھے کھڑکی کھلی تھی اور نرم نرم ہوا کے ساتھ اُس کے ہاتھوں کی ملی ہوئی حنا کی خوشبو مشامِ جان کو معطر کر رہی تھی۔ باپ ابھی ابھی کتاب مقدس کے ایک مقام کو پڑھ کر سُنا رہا تھا جہاں دنیا کی بے ثبات راحتوں اور بہشت کی ابدی لذتوں کا بیان تھا۔ آہ! معلوم ہوتا تھا کہ اس

بیان سے اُسے تسلی ہوتی ہے! والدین بڑی حسرت سے اُس کی صورت کو تک رہے تھے جو کثرتِ رنج وغم کے باعث نورانی ہو چلی تھی۔ وہ ٹکٹکی باندھے ایک طرف کو دیکھ رہی تھی۔ اور نازک نیلی نیلی انکھڑیوں میں آنسو بھرے تھے۔ ایں! کیا وہ اپنے بے وفا محبوب کو یاد کر رہی تھی یا اُس کے دل میں کچھ اور ہی خیال تھا

یکا یک گھوڑے کی ٹاپ کی آواز کان میں آئی۔ ایک سوار گھوڑا دوڑاتا جھونپڑی کے دروازے پر آیا اور جھروکے کے نیچے آکر اُتر پڑا بیچاری لڑکی نے آہستہ سی ایک چیخ ماری اور پھر اپنی جگہ لیٹ رہی۔ ہاں یہ اُس کا پشیمان عاشق تھا! وہ دوڑ کر اندر آیا اور آتے ہی اُسے سینے سے لپٹا لیا۔ نحیف و زار جسم اور مُردنی چھائے ہوئے زرد زرد پیارے چہرے کو دیکھ کر اس کے دل پر سخت چوٹ لگی۔ اس میں اتنی طاقت کہاں تھی بیٹھے ہی بیٹھے کانپتا ہوا ہاتھ اُس کی طرف بڑھایا۔ لبوں کو جنبش ہوئی مگر کوئی لفظ منہ سے نہ نکلا۔ ایک عجیب محبّت بھرے تبسّم کے ساتھ نگاہ کی اور پھر سدا کو آنکھیں بند کر لیں۔

یہ ہے وہ کہانی جو مجھے لوگوں کی زبانی معلوم ہوئی۔ واقعات کس قدر سادہ تھے مگر مجھ پر ان کا اثر ایسا ہوا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد میں بارہا اس گاؤں میں آیا اور جب آیا ارادۃً قبرستان میں گیا۔ جاڑے کی ٹھنڈی شام تھی۔ درختوں نے پتوں کا پرانا لباس اُتار دیا تھا۔ ہوا خشک گھاس میں سے سن سن کرتی آتی تھی۔ اور ہر طرف ویرانی اور بے رونقی چھائی تھی مگر معصوم گاؤں والی کی قبر پر سبز بیلیں چڑھی تھیں اور ہری ہری دوب قبر کے تعویذ پر لہلہا رہی تھی۔ وہی پھولوں کا ہار جسے میں نے میّت کے روز دیکھا تھا قبر پر لٹکتا تھا پھول تو مرجھا کر خشک بھی ہو گئے تھے۔ لیکن احتیاط کرنے والوں نے یہ احتیاط ضرور کی تھی کہ اُن کی سفیدی میں

فرق نہ آئے۔ میں نے بہت سی عجیب و غریب یادگاریں دیکھیں اور ایسی
ایسی دیکھیں کہ سنگدل سے سنگدل ناظرہ کا دل بھی اُن کو دیکھ کر بھر آئے مگر یہ
ایسی یادگار تھی کہ میرے دِل پر جتنا اُس کا اثر ہوا اتنا کبھی کسی کا نہ ہوا تھا۔

نذیر حسین

بدنصیب کا لال

مصیبت کا زمانہ پریشانی کے دن رات کا وقت برسات کا موسم مفلسی بیکسی بے بسی ماں باپ بھائی بند دیور جیٹھ ساس نند کچھ مر کر چھوٹے، کچھ جیتے جی چھوٹے دو دن کی بیاہی چوتھی کھیل سسرال آئی اُدھر بیٹی سوار ہوئی اِدھر ماں کو بخار چڑھا ہر چند ٹالا مگر ایسی گھڑی کا چڑھا کہ جان ہی لے کے ٹلا! دن بھر تو غش پڑی رہی شام کو سرسام رات کو سکرات صبح ہوتے ہوتے رخصت۔

چوتھی کی دولہن گم سم سسرال سے چلی اور روتی پیٹتی میکے آئی صبح کو پھول ہوئے گھر میں مہمان بھرے تھے باہر آبا جان کا نکاح ہو رہا تھا قصہ مختصر اماں یوں گئیں آبا یوں گئے! اور کوئی اوّل تو تھا ہی نہیں اور جو تھیں بھی تو ایک رشتے کی نانی وہ آپ جٹھانی کے ٹکڑوں پر تھیں ساٹھ پینسٹھ برس کی بڑھیا پھوس بھری بھنڈ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت بات کی نہ چیت کی کام کی نہ کاج کی ہونا نہ ہونا دونوں یکساں۔

بھائی جس کے دم سے میکا ہے بدنصیب دولہن کا کوئی نہ تھا بہنیں کہنے کو تو ماشاء اللہ ایک چھوڑ دو دو مگر دو تو اپنے اپنے گھر بار کی ایک خوشحال وہ پردیس دوسری شہر میں وہ کنگال بھی کیسی کہ اناج تک کو محتاج غرض میکے میں تو نہ کوئی نام لیوا نہ پانی دیوا لے دے کر ایک باپ کا دم سمجھ لو وہ کہیں بیٹی کل کی مرتی آج ہی مر جائے رہیں سوتیلی اماں وہ ایک دفعہ کیا کئی دفعہ اور اپنوں میں نہیں محلے والوں تک کے آگے اور چوری چھپے نہیں ہانکے پکارے اور کھلے خزانے کہتی تھی زندہ کو روٹی کیسی اللہ کرے مردے کو کفن بھی میسر نہ ہو

ساس جب تک زندہ رہیں بہو کے قدموں کے نیچے آنکھیں بچھاتی رہیں امیری نہیں غریبی اور غریبی کیسی کہ فقیری چھ ساڑھے چھ روپیہ کی آمدنی خرچ پورا کال پڑا ہوا مگر صبح کا ناشتہ مرتے دم تک ناغہ نہ کیا! وہ جیتی ہوئیں تو حمیدہ کو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا پیٹ بھر کر نہ ہوتی آدھا پیٹ! سالن نہ سہی گھی روکھی نہ ہوتی سوکھی! دو وقت نہیں ایک وقت! تازی نہیں! باسی! گھر کی نہیں بازار کی! بازار کی نہیں محلّہ کی! غرض پوری آدھی اونی پونی! اچھی بُری الٹم شٹم کسی نہ کسی طرح پیٹ میں پڑ جاتی یہ نہ ہوتا کہ صاف تین وقت کا کڑاکا گذر گیا اور چوتھے وقت بھی اللہ ہی اللہ ہے

ساس کا مرنا بہو کے سر پر دنیا بھر کی تکلیفوں کا دھرنا تھا کچھ ایسی ہوا چلی اور ایسا نصیبہ پھوٹا کہ چاروں طرف سے مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا برس کے اندر ہی اندر گھر بھر کی صفائی ہو گئی! امیراں جی میں ساس مدار میں دو نندیں رجب میں دیور غرض تین مہینے میں چار جنازے ایک گھر سے نکل گئے! ساری کائنات دو باپ بیٹے باقی رہے شبرات کا چاند ایسا بھاگوان آیا کہ ابّا جان بھی چل بسے ٹڑوں ٹوں ایک میاں بیوی رہ گئے۔ پانچ روپے باپ کی پنشن کے تھے وہ بند ہوئے ایک روپیہ ماں کے دم تک تھا وہ بھی ختم ہوا۔ آٹھ آنہ چاہے کھاؤ چاہو بیو چاہے اوڑھو چاہو بچھاؤ کچھ دن یوں بھی گذرے مگر کہاں تک اور کب تک کچھ نہ ہو تو دو میاں بیوی میں سیر بھر آٹا تو روز ہو مگر ہو کہاں سے بیوی معذور میاں مجبور اس پر طرّہ یہ کہ اِدھر آیا زچّہ خانہ اُدھر آیا رمضان دونوں کے چھکے چھوٹ گئے زچّہ خانہ کا تو ایک بہانہ تھا۔ دلوں میں غبار بھرے ہوئے تھے! میاں بیوی کو دیکھ دیکھ کر جلتے تھے۔ بیوی میاں کو دیکھ دیکھ کر جلتی تھیں۔ اٹھائیسواں روزہ ہوگا چار بجے کے قریب بیوی کو بخار چڑھا! میاں سے کہنے لگی۔

ایک روزہ اور رہ گیا ہے اللہ یہ بھی پورا کروا دے :-

(میاں) ایک ہو یا دو میں تو جیسا پریشان اب کے رمضان بھر رہا میرا ہی دل جانتا ہے! اماں جان کے سامنے میرے تیسوں روزے ہوتے تھے اب کے ایک پہلا اور ایک منجھلا کُل دو ہوئے! کیا کھا کے رکھوں اور کیا دیکھ کے کھولوں۔

(بیوی) مجھ سے پہلے رکھتے ہو تو خبر نہیں اگلے برس تو تم نے ایک بھی نہیں رکھا تم کیا اللہ بخشے خود ابا جان ہی گنڈے دار رکھتے تھے گھر بھر میں ایک اماں جان البتہ روزے کی پابند تھیں باقی تو سب چھوٹے اور بڑے دن دہاڑے دھڑتے سے کھاتے تھے۔

(میاں) تم ایسی بیہودہ باتیں کیوں کرتی ہو پندرہ دن کی بیاہی چالوں کی دُلہن تم کو کیا معلوم کس کا روزہ ہے کس کا نہیں یا جو دل میں آیا کہہ دیا جو مُنہ میں آیا۔ بک دیا۔ رَو میں آئیں تو چھوٹے بڑے مُردے زندے سب کو دُکھاڑ پھینکا۔

(بیوی) سبحان اللہ! دُلھن تھی اندھی تو نہ تھی! منہ پر گھونگھٹ تھا یا کانوں میں ٹھیٹیاں! دیکھتی نہ تھی سنتی تو تھی! پکتا تھا اور میں جانتی نہ تھی کھاتے تھے اور مجھے خبر نہ ہوتی تھی۔

(میاں) جب کیا میں تو اب بھی اور فقط اندھی ہی نہیں اس کے ساتھ بدتمیز۔ بے ڈھنگی پھوہڑ بدسلیقہ بلکہ اس سے بھی بدتر سمجھتا ہوں ایسی نیک قدم آئیں کہ سب ختم ہو گئے۔

(بیوی) میں منحوس تھی کہ گھر بھر کو موس لیا! ساٹھ برس کے بڈھے بھوس میں کھا گئی! تم تو بھاگوان تھے کہ میری جوان اماں کو نوش جان کر گئے۔ تقدیر پھوٹنی تھی پھوٹ گئی۔ پیٹ بھرنے کو ٹکڑا نہ تن ڈھکنے کو چیتھڑا! فاقوں تک کی نوبت آ گئی اور کیا ہوگا۔

(میاں) ہم نے تو چڑھا دے ہی کے وقت کہہ دیا تھا کہ رُوکھی بلکہ سُوکھی

روٹی ہے اماں کی قبر پر جا کر جوتیاں مار و اندھی تھوڑی تھیں۔ کیا دیکھ کر کہا تھا! ہاتھی جھوم رہے تھے؟

(بیوی) کیوں مرے ہوؤں کا صبر سمیٹے ہو! خیر اس تو تو مَیں مَیں سے کیا حاصل ہیں تو ڈیڑھ کلام جانتی ہوں ہاتھ پکڑ کے نکال باہر کرو۔ تم کو سلام تمہارے گھر کو سلام ہیں ایسے گھر سے باز آئی! اشراف ہوں گی تو پھر نام نہ لوں گی۔

(میاں) شرافت کیا ہوئی ایک آفت ہو گئی میری طرف سے تم! ابھی بسم اللہ کرو تم نام نہ لو گی تو میرا بھی کوئی پیغام نہ جائے گا! بس اب منہ سے کہا ہے تو کر کے دکھاؤ۔

(بیوی) آگ لگے ایسے بیاہ کو اور بھاڑ میں جائے ایسا سہاگ اذان کی آواز کان میں آ رہی ہے روزہ نماز گیا گذرا ہوا۔

دن بھر کا روزہ رات بھر کا فاقہ مٹکے کے پاس گئی تو پانی کی بوند نہیں آبخورے میں نون ڈھونڈھا وہ نہ ملا کٹورے میں دو چھوہارے رکھے تھے وہ چوہا لے گیا چوٹھے کے پاس یہ کہتی ہوئی آئی!

خاک میں ملوں میں رکھتی جو راکھ سے روزہ کھولوں۔

چوبیس پچیس گھنٹے کی بھوکی پیاسی بخار چڑھا ہوا آنکھوں میں حلقے زبان پر کانٹے ہاتھ میں طاقت نہ پاؤں میں سکت روزہ کھول کر نماز کو چلی! چکر آیا اور چکر کے ساتھ دیوار کی ٹکر اس زور سے لگی کہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی! روکر کہا!

"بس میں بھر پائی اب خدا مجھ کو موت دے"!

بیوی نماز کو کھڑی ہوئیں میاں نے اپنا اسباب باندھنا شروع کیا وہ اسباب ہی کیا تھا پرانے تین جوڑوں کی ایک گٹھڑی ٹوٹا ہوا حقہ پھٹی ہوئی رضائی چوہا نکلے ایک چیتھڑا دری! بیوی کھڑی دیکھتی کی دیکھتی ہی رہی

اور میاں اپنا آخنز بخنز لے لا یہ جا وہ جا۔
گئے اور ایسے گئے کہ بچّہ تک ہو گیا اور بچے کے باپ نہ پلٹے
اچھّے بُرے امیر فقیر کماؤ نکھٹّو ! شریف، رذیل، معزز، ذلیل، ہندو اور مسلمان، بڈّھے اور جوان، شیخ، سید، مغل، پٹھان، پنجابی اور بنگالی اسیری واستو اور دل والی کچھ دیکھے کچھ برتے مگر یہ اندھیر نہ کہیں دیکھا نہ سُنا پورے دن بیوی پہلوٹھی کا زچہ خانہ سر پر ساس نہ آدھی پاس نل بٹے کا برتن نہ گہنے کا تار۔ ماں سوتیلی، باپ بیزار اور میاں کو گھر میں قدم رکھنا حرام ! کمبخت صورت شکل کا اچھّا جوان تندرست پڑھا لکھا موٹا تازہ کچھ نہ ہوتا تو چپڑاسی تو ہو جاتا۔ مگر کون ہوتا اور کیوں ہوتا ! بُری صحبت نے غیرت اور حمیّت سب غارت کر دی ! مزے سے تاش پچیسی اور چین سے سلفی کعبتین دن بھر پھڑوں میں رہے رات کو جہاں جگہ ملی پڑ رہے۔
تکلیف ہو خواہ آرام عمریں ختم ہو رہی ہیں اور زمانہ اڑا چلا جا رہا ہے۔
وہ وقت آن بھی پہنچا اور نکل بھی گیا۔ کسی کا کام اٹکا نہیں رہتا۔ خدا اُس کی بیوی کا بھلا کرے ساس سے زیادہ اور ماں سے بڑھ کر خدمت کی۔ بچّہ ہوا ! پلا ! بڑھا ! جس رات کا ذکر ہے ماشاءاللہ برس سوا برس کا تھا۔
برسات کے دن تو تھے ہی مینہ کا برسنا کوئی نئی بات نہ تھی مگر خرابی یہ ہوئی اِدھر تو مینہ اور مینہ بھی کیسا کہ موسلادھار اور گھنٹہ نہ آدھ گھنٹہ بلکہ پورا چار پہر اوپر سے چلی ہوا اور وہ بھی پوروا۔ ہو گیا ایک طوفان تھا کہ مکان اور دکان در سے اور دالان اڑاڑا کر کے آ رہے تھے۔ نہ اندھیا وئے کم ہوتا تھا نہ جھکڑ تھمتا تھا رات کا سنّاٹا ! ہوا کا فرّاٹا ! کڑک ! چمک ! مرد دل تک کے کلیجے دہل رہے تھے ! بارش کیا آفت بلکہ قیامت تھی کہ جانوں کے لالے پڑ گئے عورتیں اور مرد بڈّھے اور جوان ! گھر بار کمرے دالان کپڑے لتے اوڑھنا بچھونا ! روپیہ پیسہ چاندی سونا ! گہنا پاتا برتن بھانڈا پلنگ چارپائی

سب چھوڑ چھاڑ انگنائی میں آ بیٹھے! بھیگیں گے تو بلا سے جان تو بچے گی۔ ہر طرف آفت ہپا تھی! مکان گرا! دیوار آئی! سائبان اُڑا! چھل نکلی! چھجہ پھولا! زینہ پھٹا! آدھی رات اور خلق خدا کی گریہ وزاری! مینہ کیا ایک چاندماری تھی کہ چاروں طرف سے دُھوں دُھوں آوازیں آ رہی تھیں۔

حمیدہ غریب بدقسمت بدنصیب عورت ذات نہ کوئی سنگ نہ ساتھ اس قیامت کی گھڑی کو اکیلی کھڑی گذار رہی تھی! قدرت کے کھیل تھے۔ چراغ تھا نہ تیل! اندھیرا گھپ اور اس آفت کا سامنا! بدقسمتی سے دروازہ میں کواڑ بھی ایک تھا! ہوا کا جھکڑ کواڑ کی دھڑ دھڑ! دم پر بنی ہوئی تھی ذرا کھٹکا ہوا اور جان نکلی! عالیشان محل اور بڑی بڑی حویلیاں پکی پکی محلسرائیں! کوئی گر رہا تھا کوئی جھک رہا تھا کوئی بیٹھ رہا تھا! حمیدہ مظلوم کا مکان تو کس گنتی میں تھا لیبی کوٹھڑی چھوٹا درا ثمام والی دیوار شام ہی بیٹھ چکی تھی پاخانہ اور پاخانے کے ساتھ ہی باورچی خانہ اب آئے۔

مینہ کی جھڑی لگی ہوئی تھی اور حمیدہ کھڑی اللہ اللہ کر رہی تھی۔ آسمان پر نگاہ اور بچے میں جان! دروازے پر دھیان اور درے کی طرف کان! ایک آفت ہو تو کہی جائے ہر طرف مصیبت ہی مصیبت تھی۔ حمیدہ اکیلی کا اللہ ہی بیلی تھا چھت کہتی تھی اب گری در کہتا تھا اب بیٹھا! پہاڑ سی رات ایک کواڑ کا گھر جان کا خوف چور چکار کا ڈر جن بھوت کا اندیشہ! دل ہوا ہو رہا تھا۔ مٹی تو دوپہر ہی سے جھڑ رہی تھی اب منڈیر کی اینٹیں بھی گرنی شروع ہو گئیں! اینٹوں کا گرنا تھا کہ حمیدہ بالکل ہی بے آس ہو گئی بدحواس ہو کر بچہ کو گود میں اُٹھا لیا اور انگنائی میں آن کھڑی ہوئی بچہ کا اُٹھانا تھا کہ اس اللہ کے بندے نے بلکنا شروع کیا بہتیرا ہی بہلایا مگر توبہ کس باپ کا بچہ تھا جوں جوں چمکارتی تھی اور دُگنا ہوتا تھا تھپکا دودھ دیا بہلایا پھسلایا ٹہلی کلیجہ سے لگایا سب ہی کچھ کیا مگر اُس کی چیخم دہاڑ نہ تھمی! ہائے مامتا اس برس بھر کی جان پر اپنی

جوان جان قربان تھی اِس پھول کے رونے میں سب بھول گئی خدا خدا کر کے صبح ہوتے اِدھر مینہ تھما اور اُدھر ہوا کم ہوئی بچے نے بھی دم لیا تو ذرا جان میں جان آئی۔ ایک ٹوٹی ہوئی کھٹولی اندر سے لائی پھٹی ہوئی رضائی اس پر بچھائی اور بچے کو کلیجے سے لگا کر انگنائی میں لیٹ رہی! بچہ ہلکان ہو کر جو پڑا اِدھر ملی لوری اُدھر لگا پکھوا دودھ مُنہ میں لیتے ہی گلے میں ہاتھ ڈال کر سو رہا! اللہ اللہ! بچہؔ کا کلیجے سے لگ کر سونا تھا کہ وہ رات بھر کی مصیبت و پریشانی کچھ بھی یاد نہ رہی۔ میاں کی بے اعتنائی باپ کی لاپروائی اپنی تنہائی سب بھول گئی! مامتا کے جوش میں زور زور سے بھینچتی تھی اور کہتی تھی۔

میں کیا کسی کی پروا کرتی ہوں اللہ میرے بچےؔ کی عمر میں برکت دے میرا میاں تو یہ ہے۔

زندگی کی تمام خوشیاں اور جوانی کی بہاریں اُس ننھّی سی جان پر نثار تھیں! اُس ہی دم کے ساتھ عمر کی تمام آرزوئیں اور ارمان لگے ہوئے تھے۔ لپٹ رہی تھی اور لپٹا رہی تھی اور چمٹ رہی تھی اور چمٹا رہی تھی۔ حمیدہ مظلوم اسی طرح قربان ہو رہی تھی کہ برابر کی مسجد سے اذان کی آواز آئی! اُٹھی درود شریف کا جزدان بچے کے پاس لا کر رکھّا! وضو کیا اور نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی۔

عبدالرشد الخیری

بے سروسامانی

جدھر نظر اُٹھا کر دیکھو۔ ایک دنیا سروسامان کی فکر میں سرگرداں نظر آتی ہے۔ کوئی کامیاب ہو کوئی ناکام۔ مگر یہ دُھن اور یہ سودا ہر سر میں موجود ہے۔ کہ مکان ہو آراستہ۔ اور لباس ہو پیراستہ۔ گاڑی گھوڑا سواری کے لئے مل جائے دو چار نوکر چاکر خدمت میں حاضر رہیں۔ اور کچھ نہیں تو کچھ زر و جواہر بھی مضبوط صندوق آہنی میں بند ہوں۔ بازار میں ہو کر نکلیں تو دس بیس سلامی ہوں۔ اور گھر میں بیٹھیں تو کوئی آکر پرسان حال ہو۔ کسی مجلس میں جائیں تو لوگ تعظیم کو اُٹھیں اور خلوت میں ہوں تو احباب دیکھنے کے لئے اجازت کے طلب گار ہوں۔ یہ باتیں لوازم شائستگی و تہذیب سمجھی جاتی ہیں اور ہر شخص دل و جان سے انہی باتوں کا فدائی ہے کون سی مصیبت ہے جسے انسان اس مقصد عالی کے حاصل کرنے کے لئے نہیں اُٹھاتا۔ بچہ مدرسہ اور مکتب میں جا کر جو ر اُستاد سہتا ہے تو اسکے ننھے سے دماغ میں یہی خیال ہوتا ہے۔ جو والدین کی باتوں سے اُسکے ذہن میں جاں گزیں ہو گیا ہے۔ ذرا اور بڑا ہوا۔ اور مدرسہ سے نکلکر بیت العلوم میں پہنچا۔ تو کیا پوچھنا۔ ہوا کے گھوڑوں پر سوار ہے۔ اُمنگوں اور آرزوؤں کا لشکر دل میں ہے اُمید کا لہلہاتا ہوا باغ آنکھوں کے سامنے ہے۔ یاس کا کانٹا نظر سے اُوجھل ہے کوئی محتاط تجربہ کار جتا بھی دے۔ کہ ذرا ہوشیار رہنا یاس اُمید کے ساتھ لگی ہوئی ہے تو اُس کی یہ تنبیہہ بُری معلوم ہو۔ یاس کا خیال دل میں لانا تک روا نہیں۔ عہد شباب کی مستی اور اس پر نشۂ علوم۔ کتاب ہاتھ میں ہے۔ کبھی کمرے میں ٹہل رہے ہیں اور پڑھ رہے ہیں۔ کبھی باغوں کی روشیں ہیں اور اُن پر ٹہلتے ہوئے کتاب کا رٹنا۔ کبھی آدھی رات ہے اور چراغ اور

طالب علم آخر فارغ التحصیل ہو کر نکلتا ہے۔ قویٰ مضمحل۔ دماغ پریشان اور وہی تلاش سر و سامان پیش نظر۔ اس جستجو کے زمانے میں بے سر و سامانی یونہی ذرا سی جھلک دکھاتی ہے۔ وجہ معاش پیدا کرنے میں دقتوں کا سامنا ہوتا ہے۔ روزی کے سب دروازے بند نظر آتے ہیں۔ کوئی کھلے بھی تو کلید زر سے کھلتا ہے۔ اور اسی کی کمی ہے۔ اپنی محنت پر کچھنا وا شروع ہوتا ہے لوگ کہتے ہیں۔ پڑھ پڑھ کر دیوانہ ہو گیا ہے۔ اور یہ فرماتے ہیں کہ جناب من اسال ہا سال "دود چراغ خوردہ سحر کردہ ام بروز" پھر اگر دماغ میں خشکی کا اثر ہو تو آپ تعجب کیوں کرتے ہیں "معذورم ار نماند دماغ مرا تری" اتنے میں امید و بیم کے بھنور میں غوطے کھاتے کھاتے آخر اس کی امیدوں کی کشتی ساحل مراد پر جا لگتی ہے اور کامیابی کی ہوا سر میں سماتی ہے۔ وہ ساز و سامان جس کی جستجو تھی۔ سارا نہیں تو آدھا میسر آنے لگتا ہے پیٹ میں روٹیاں آتے ہی چودہ طبق منوّر نظر آتے ہیں اور سرفروشی کی سوجھتی ہے۔ مئے گلرنگ کے دور چلتے ہیں اور عیش و نشاط کے طور ہوتے ہیں۔ اس وقت کوئی بے سر و سامان اپنا دکھڑا روئے۔ یا کوئی اور اس کے لئے مدد مانگے تو ایسے کاموں کی ہوش کسے۔ اپنی کامیابی میں مست ہیں۔ ابھی یہ نشہ اترا نہیں ہوتا کہ حرص اور ناصبوری آ کر اپنا سکّہ جماتی ہے۔ جو سامان عیش میسّر ہے وہ نظر میں ہیچ نظر آنے لگتا ہے اور اس سے بڑھ کر ساز و سامان کی تلاش ہوتی ہے۔ اور کچھ ملنے پر دہان طمع سے "ہل من مزید" کی صدا نکلتی ہے۔ یہ وہ مرض ہے جسے امراض اخلاقی کے اطبّا نے لا علاج قرار دیا ہے۔ اور اسی کی بدولت یہ نوبت پہنچتی ہے۔ کہ آدمی کی آرزوؤں کا جہاز مایوسی کی چٹان سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ اور ہمیشہ کے لئے کام سے جاتا رہتا ہے۔ اس مایوسی میں ایک حالت انسان پر آتی ہے۔ جس میں نہ صرف بے سر و سامانی کی قدر آ جاتی ہے بلکہ حصول کی تمنا پیدا ہوتی ہے۔ یہ فقط انتہائے یاس کا ایک ظہور ہوتا ہے۔ ورنہ کسی

کے دل کو ٹٹول کر دیکھا جائے تو اس میں پھر کوئی نہ کوئی حسرت بھری ہوئی ہوتی ہے۔ اِس کیفیتِ قلبی کا ایک عجیب اور پُر زور نقشہ مرزا اسداللہ خاں غالب نے کھینچا ہے۔ گویا بے سر و سامانی کی تصویر کھینچ دی ہے۔

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار کا اِک گھر بنانا چاہیئے کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

مگر یہ بے سر و سامانی اشعار میں ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ جب سب سامان موجود ہوں اور کسی ایک آدھ اُمید میں ناکامی کا سامنا ہو جائے تو ناز پروردہ انسان اپنی بے اطمینانی کا اظہار اِس طرح اپنے آپ کو کوس کوس کر کرتا ہے لیکن اگر ایسا خوفناک سماں کبھی فی الحقیقت موجود ہو۔ تو آدمی فوراً گھبرا جاتا ہے۔ بڑے بڑے فلسفی جو دُنیا کو قناعت کا وعظ سناتے تھے۔ جو تنہائی کی خوبیاں گھنٹوں تک اس فصاحت سے بیان کرتے تھے کہ سُننے والے اُنکی شیرینیِ کلام پر عش عش کرتے تھے۔ جو ماں کو سمجھاتے تھے کہ جُدائی سے نہ گھبرانا جو باپ کو تسلی دیتے تھے۔ کہ غم نہ کھانا۔ جو بیوی کو بہلاتے تھے کہ خیریت ہے چار دن مشکل کے ہیں۔ پھر اِسی حلقہ خانہ داری میں آئے جاتے ہیں۔ اُن لوگوں کو دیکھا گیا ہے۔ کہ جب کبھی عارضی طور پر وہ بھی امتحان میں ڈالے گئے ہیں اور اُنہیں تنہائی کے صدمے۔ فرقت کے رنج اور بے سر و سامانی کے غم اُٹھانے پڑے ہیں تو آخر اُن کی ثابت قدمی اُن کو جواب دے گئی ہے۔ اور وہ بے صبری سے چلّا اُٹھے ہیں۔ ہائے وہ پہلی حالت! اس وقت شاید انہیں خیال آتا کہ اصلی بے سر و سامانی خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ مگر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اُن میں کسی کسی نے عہد کر لیا ہو۔ کہ اگر اب کے بہ خیریت اپنی پہلی حالت کو پہنچ جاؤں تو نہ صرف سجدۂ شکر ادا کروں گا۔ بلکہ خدا کی شکرگذاری کا عملی ثبوت اُس کے ایسے بندوں کے ساتھ جو سر و سامان نہیں

رکھنے۔ بھلائی کرنے سے دوں گا۔ گرما میں اپنے غسخانہ و برفاب سے آرام پاتے ہوئے غربا کو کم از کم ٹھنڈا پانی پلاؤں گا۔ سرما میں اپنے حماموں اور انگیٹھیوں سے آسائش حاصل کرتے ہوئے یہ بھی ذہن میں رکھوں گا۔ کہ کئی ایسے بھائی ہیں جن کے پاس آگ تاپنے کو نہیں۔ کمبل اوڑھنے کو نہیں۔ گدڑی بچھانے کو نہیں۔ اور یہاں تک کہ کہیں چیتھڑا بدن ڈھکنے کو نہیں اور اپنے اپنی زندگی کا مقصد اعلیٰ بناؤں گا۔ کہ جہاں اپنے لئے لباس حریر و سمور یا کم از کم بانات کے کوٹ سلاؤں گا۔ وہاں بے سر و سامانوں کے لئے کچھ موٹے جھوٹے چوغے چھینٹ کے یا کسی سستے گرم کپڑے کے بھی تیار کرا دوں گا اور انہیں اس بے سر و سامانی سے بچاؤں گا جس کے سامنے کھاتے پیتے چلتے پھرتے تندرست توانا اور کامیاب لوگوں کی نازک دماغی سے بھری ہوئی شکائتیں ہیچ ہیں۔ انہیں نہ صرف اپنے متعلق قناعت سے کام لینا چاہئے۔ بلکہ دوسروں کی بے سر و سامانی سے اپنی ثروت کا مقابلہ کر کے جس حد تک ممکن ہو۔ دوسروں کی بھلائی میں کوشش کرنی چاہئے۔ کیونکہ اس سے انہیں وہ سر و سامان ملے گا جسے نہ گھن کا ڈر ہے۔ نہ زنگ کا۔ جو جتنا پرانا ہوگا چمکے گا اور جتنا بانٹا جائے گا بڑھے گا۔

شیخ عبدالقادر

اعراف کی ایک رُوح

فرشتے آسمان پر اپنے اپنے عود بجا رہے ہیں۔ اور اُن کی سُریلی آوازیں مثل خوشبو کی لپٹوں کے خدائے بلند کے عرش تک پہنچتی تھیں۔ مگر سرا نیم کا راگ اپنے سب ساتھیوں سے شیریں اور دلفریب تھا۔ اور اُس خدائے غائب کی آواز اس طرح آتی ہوئی سُنی جاتی تھی" اے سرا فیم۔ اس آتش محبت کے صلے میں جو تیرے راگ سے نکلتی ہے مانگ کیا مانگتا ہے جو تو مانگے تجھے مل جائے" سرا فیم بولا سُنا ہے کہ کوئی جگہ ایسی ہے جو اعراف کہلاتی ہے۔ جہاں دوزخ سے تو امن ہے مگر جو بہشت کے مقابلے میں تکلیف کا گھر ہے۔ وہاں بہت روحیں تیری عبادت کرتی ہیں۔ مگر اپنے گناہوں کی سزا پوری پوری پاتی ہیں۔ اے خدا مجھے اجازت دے کہ کبھی کبھی میں اُن کے پاس ہو آیا کروں اور اپنے عود کے راگ سے جس کو تیری تعریف نے مقدس بنایا ہے اُن کی تکالیف کو تسکین دیا کروں۔

آواز آئی کہ ہاں! اے فرشتوں میں سب سے زیادہ رحم دل! تیری دُعا مقبول ہوئی اور اُسے بہت بھلی معلوم ہوئی جو سزا و جزا دیتا ہے۔ مگر محبت سے تیری تمنا بر آئی!!

سرا فیم نے پھر تو خوب حمد گائی۔ اور جب راگ ختم ہو چکا تو اپنے زمردیں تخت پر سے اُٹھا اور اپنے رنگا رنگ کے پروں کو پھیلا کر اِس غمناک مقام پر جو زمین کے بہت ہی قریب ہے پہنچا۔ یہ مقام اُن روحوں کی چیخوں سے گونج رہا تھا جو تکلیف اُٹھانے کے بعد پاک ہو جاتی تھیں۔ یہ بدنصیب روحیں یہاں سے اُن عالی شان مکانات کو دیکھتی تھیں جو اُنہیں

بعد میں ملنے والے تھے۔ اور اس بلند مرتبہ مخلوق پر حسرت سے نگاہ کرتی تھیں جو بقا کے چشمے سے سیراب ہو کر بہشت کے باغوں میں چہل قدمی کرتی پھرتی تھی اور خیال کرتی تھی کہ اُن کی خوشی غیر متناہی ہے یہ خیال تکالیف میں اُن کو تسلی دیتا تھا اور اعراف اور دوزخ میں جو صحیح فرق ہے وہ یہی ہے۔

پھر سرافیم نے اپنے پروں کو سمیٹا۔ اور بلوری دروازوں میں داخل ہو کر ایک ویران چٹان پر بیٹھ گیا اور اپنا مقدس راگ چھیڑا۔ فوراً ہی بدنصیب روحوں کو راحت سی محسوس ہونے لگی۔ اور عذاب کے فرشتے ایذا دہی سے باز رہ گئے۔ اور گنہگار روحوں نے چلانا موقوف کر دیا۔ دنیا کے زخم رسیدوں کے لئے جیسی نیند مرہم ہے ایسا ہی سرافیم کا راگ اُن روحوں کے لئے تسکین بخش تھا۔ اِس عالم خاموشی میں سرافیم کو معلوم ہوا کہ صرف ایک آواز ایسی ہے جو اس کے راگ سے خاموش نہیں ہوئی یہ ایک عورت کی آواز تھی اور وہ نہایت زور سے چنگھاڑیں مارتی تھی اور کہتی تھی۔

"اے اُدن ہیم۔ اُدن ہیم۔ مجھ کھوئی ہوئی کا تو رنج نہ کر"

نیک فرشتے نے راگ پر راگ بجایا یہاں تک کہ اُس کا موسیقی کا علم ختم ہو گیا۔ لیکن اس چیخنے والی کو اِس نہایت ہی شیریں اور دلفریب راگ کی خبر بھی نہ ہوئی اور اس کی طرف دھیان بھی نہ کیا۔ اور چلاتی رہی۔

"اے اُدن ہیم۔ اُدن ہیم مجھ کھوئی ہوئی کا تو رنج نہ کر"

اِس پر سرافیم کو بہت زیادہ خیال ہوا اور اس جگہ پہنچا جہاں سے وہ آواز آرہی تھی۔ دیکھتا کیا ہے کہ ایک نوجوان حسین لڑکی کی روح ایک چٹان سے مضبوط زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اور عذاب کے فرشتے اُس کے نزدیک آرام سے پڑے ہیں۔ سرافیم نے اُن سے کہا "کیا میرے راگ نے تمہیں ایسی لوری دی کہ تم یوں مدہوش ہو گئے؟"

اُنہوں نے کہا اُس لڑکی کو ایک شخص کی یاد زیادہ تکلیف دہ اور تلخ

ہے ہمارے عذاب سے۔ اور اسی لئے ہم نکمّے پڑے ہیں؟

تب وہ نیک فرشتہ اُس روح کے پاس پہنچا اور ایک ایسے لہجے میں اس سے مخاطب ہوا کہ وہ چلّانے سے خاموش ہو گئی (اور کیوں نہ ہو۔ ہمدردی سے ہم کسی حالت میں لاپرواہ نہیں ہو سکتے) کس لئے! اے لڑکی! کس لئے تو اسی ایک غمناک لہجے میں روئے جاتی ہے؟ اور کیوں میرا راگ تجھے تسکین دینے میں ناکامیاب رہا؟ حالانکہ تیرے ساتھیوں میں سے بڑے سے بڑا مجرم بھی اس سے تسلّی پاتا ہے۔

اس غریب روح نے جواب دیا۔ "اے روشن چہرے والے اجنبی کیا تو مجھ سے مخاطب ہے؟ مجھ سے؟ جس نے خدا سے زیادہ خدا کے ایک بندے سے محبّت کی۔ اور اسی لئے یہ بھگت رہی ہوں۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ میرا غریب اور مغموم میرے لئے دن رات روتا ہے۔ اور اس کے رنج کا خیال میرے لئے زیادہ ناقابلِ برداشت ہے اُن تکالیف سے جو یہ عذاب کے فرشتے مجھ پر ڈال سکتے ہیں۔"

نیک فرشتے نے پوچھا اے۔ تجھے کس طرح معلوم ہے کہ وہ تیرے لئے نالہ و زاری کرتا ہے۔

روح نے نہایت سادگی سے جواب دیا "اس طرح کہ میں جانتی ہوں کہ میں اس حالت میں اس کے لئے کس جانکنی سے تڑپتی ہوں" اس نیک طبیعت فرشتے پر اس کا بڑا اثر ہوا کیونکہ خدا نے اپنی مخلوق کی طبیعتوں میں قدرتاً محبّت رکھی ہے اور اُس نے کہا "میں تیرے غم کی کس طرح امداد کر سکتا ہوں"؟

روح اس یکایک خوشی سے بیتاب ہوئی اور اپنے غیر محسوس ہاتھوں کو پھیلا کر بولی۔

"اے مجھے اجازت دے۔ اے مجھے اجازت دے کہ میں زمین پر ہو

آؤں۔ صرف ایک ہی گھنٹے کے لئے۔ تاکہ میں اپنے اون ہیم کو ایک نظر دیکھ لوں۔ اور اپنی موجودہ تکالیف کو اُس سے چھپا کر اس کے رنج و غم میں اُس کی تسلی کروں"۔

نیک فرشتے نے کہا "افسوس" اور اپنی آنکھیں اُس سے پھیر لیں کیونکہ فرشتے دوسروں کے سامنے نہیں روتے۔ افسوس! میں بیشک تیری یہ آرزو پوری کر دیتا۔ مگر تجھے نہیں معلوم کیا تاوان تجھے اُس کے عوض میں دینا پڑیگا اعراف کی روحیں زمین پر جا سکتی ہیں مگر اُن کی واپسی پر اُنہیں ایک گراں تاوان دینا پڑتا ہے۔ غرض اگر تو ایک گھنٹے کے لئے زمین پر جانا چاہتی ہے تو تیری یہ عذاب کی قید یہاں ایک ہزار برس اور زیادہ ہو جاوے گی"۔

روح نے چلّا کر کہا "بس صرف یہی نا؟ میں تو نہایت خوشی سے اس کے لیئے آمادہ ہوں۔ آہ یقیناً آسمان والوں میں محبت جاری نہیں ہے ورنہ تجھے معلوم ہوتا اے آسمانی ملاقی! کہ وہ ایک ساعت جو اپنے محبوب کی تسکین اور تسلّی میں ہم صرف کریں قیمت میں اُن ہزار برس کے برابر ہے۔ جو ہمیں عذاب و تکالیف میں کٹیں۔ اے! تو مجھے اپنے اون ہیم کو تسلّی اور تشفی دینے دے۔ اِس کا مضایقہ نہ کر کہ مجھ پر کیا گذرے گی"۔

نیک فرشتے نے آنکھ اُٹھا کر اوپر کی طرف دیکھا اور اُسے دور سے وہ شعاعیں نظر پڑیں جو خدا کی عالم میں آنکھ سے نکلتی تھیں اور جن کے دیکھنے کی تاب کوئی اور نہ لا سکتا تھا۔ اُس نے خدا سے لایزال کی یہ آواز سُنی "جو تجھے رحم کہتا ہے وہ کر"۔

اُس نے پھر اُس روح کی طرف نظر کی اور دیکھا کہ اُس کے ہاتھ اُس کی طرف التجاءً پھیلے ہوئے ہیں۔ پس اُس نے وہ الفاظ پڑھے جن سے اعراف کے دروازے کی کُنڈیاں کھل گئیں۔ اور لو۔ وہ روح انسانی دنیا میں داخل ہو گئی۔

اس وقت رات تھی اور لارڈ اون ہیم اپنے محلوں میں اپنے جگمگاتے تخت کے صدر پر بیٹھا ہوا تھا۔ لمبے لمبے قہقہے باواز بلند لگتے تھے اور مذاق اور چہل کی آوازیں گونج رہی تھیں لارڈ اون ہیم کا قہقہہ اور مذاق سب سے زیادہ بلند اور سب سے زیادہ خرم تھا۔ اس کے دائیں پہلو پر ایک حسین لڑکی بیٹھی تھی اور وہ بار بار اوروں کی طرف سے منہ پھیر پھیر کر اس کے کان میں کچھ کہتا تھا۔

اس حسین اور نازک بیگم نے کہا۔ "و۔ تیرے لفظوں کا کون شریف عورت اعتبار کرے گی تو نے حسین آئیڈا سے یہی قسمیں نہ کھائی تھیں اور ایسا ہی اظہار محبت نہ کیا تھا؟ آسے تو مرے ہوئے بھی صرف تین ہی مہینے ہوئے ہیں"

نوجوان لارڈ اون ہیم نے جواب دیا۔ "خدائے پاک کی قسم تو اپنے لاجواب حسن سے سخت ناانصافی کرتی ہے۔ نہیں۔ تو میرا مضحکہ اڑاتی ہے۔ آئیڈا سے میں اور محبت کروں!!! تو پھر میں تیرے قابل کیونکر ہوں؟ اون ہیم کو جو کچھ محبت آئیڈا سے تھی وہ اتنی ہی تھی کہ چند مزاح انگیز الفاظ اور چند مرنے کے تبسم میں محدود ہو سکتی ہے! اور بس کیا یہ میرا قصور تھا اگر اس بیوقوف نے اس عالم خلق کے معنے غلط سمجھے۔ نہیں۔ میری پیاری۔ یہ دل صرف تیرا ہی ہے"۔ حسینہ بیگم بولی "تو کیا تجھے اس کے مرنے کا افسوس نہیں ہوا"۔ اس نے کہا "ہاں ضرور ہوا۔ مگر صرف ایک ہفتے تک۔ اب تو میں تیری دلکش نگاہوں میں فوری تسکین پاتا ہوں"۔

اس وقت لارڈ اون ہیم نے ایک سرد آہ اپنے پیچھے سے سُنی۔ منہ پھیرا مگر کچھ نہ دیکھا بجز ایک دھوئیں کے جو فوراً ہی اڑ گیا اور غائب ہو گیا۔

جب وہ دھوکا کھانے والی آئیڈا کی روح اعراف میں واپس پہنچی تو سرابیم نے پوچھا۔ کیا تو اپنے محبوب سے نہیں ملی؟ اور اس کام کو انجام نہیں دیا

جس کے لئے تو گئی تھی؟"

غریب آئیڈا نے جواب دیا "عذاب کے فرشتوں سے کہہ دو کہ اپنا عذاب شروع کریں"

تو کیا صرف اسی بات کے واسطے تو نے ہزار برس اپنی قید میں بڑھوائے ہیں"؟

"افسوس" آئیڈا نے جواب دیا "اس ایک واحد گھنٹے میں زمین پر جو کچھ مجھ پر بیتی۔ اُس کے مقابلے میں یہ ہزار برس کی اعراف کی تازہ تکلیف کچھ بھی نہیں"

سرابیم نے کہا "تو کیا بس یہی محبت ہے جس کا دعویٰ زمین والے کیا کرتے ہیں؟؟؟"

خواجہ لطیف احمد بی۔اے

کوہستان ہمالہ

شیخ محمد اقبال صاحب اقبال ایم اے قائم مقام پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور جو علوم مغربی و مشرقی دونوں میں صاحب کمال ہیں۔ انگریزی خیالات کو شاعری کا لباس پہنا کر ملک الشعرائے انگلستان ورڈس ورتھ کے رنگ میں کوہ ہمالہ کو یوں خطاب کرتے ہیں۔

اے ہمالہ اے فصیلِ کشورِ ہندوستان — چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسمان
تجھ پہ کچھ ظاہر نہیں دیرینہ روزی کے نشان — نوجواں ہے دورۂ شام و سحر کے درمیان

تیری ہستی پر نہیں بادِ تغیّر کا اثر
خندہ زن ہے تیری شوکت گردشِ ایام پر

امتحانِ دیدۂ ظاہر میں کوہستان ہے تو — پاسباں اپنا ہے تو دیوارِ ہندوستاں ہے تو
سوئے خلوتگاہِ دل دامن کشِ انسان ہے تو — مطلعِ اوّل فلک جس کا ہو وہ دیواں ہے تو

برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالمتاب پر

سلسلہ تیرا ہے یا بحرِ بلندی موجزن — رقص کرتی ہے مزے سے جس پہ سورج کی کرن
تیری ہر چوٹی کا دامانِ فلک میں ہے وطن — چشمۂ دامن میں رہتی ہے مگر پرتو فگن

چشمۂ دامن ہے یا آئینۂ سیّال ہے
دامنِ موجِ ہوا جس کے لئے رومال ہے

ابر کے ہاتھوں میں رہوارِ ہوا کے واسطے — تازیانہ دے دیا برقِ سرِ کوہسار نے
اے ہمالہ کوئی بازیگاہ ہے تو بھی جسے — دستِ قدرت نے بنایا ہے عناصر کیلئے

ہائے کیا جوشِ مسرت میں اُڑا جاتا ہے ابر

فیل بے زنجیر کی صورت چلا جاتا ہے ابر

جنبشِ موجِ نسیمِ صبح گہوارہ بنی — جھومتی ہے کیا مزے لے لیکے ہر گل کی کلی
یوں زبانِ برگ سے کہتی ہے اسکی خامشی — دستِ گلچیں کی جھٹک میں نے نہیں دیکھی کبھی

کہہ رہی ہے میری خاموشی ہی افسانہ مرا
کنجِ قدرت خانۂ قدرت ہے کاشانہ مرا

نہر چلتی ہے سرودِ خامشی گاتی ہوئی — آئینہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی مانند لہراتی ہوئی — ناز کرتی ہے فرازِ راہ سے جاتی ہوئی

چھیڑتا جا اس عراقِ دل نشیں کے ساز کو
اے مسافر دل سمجھتا ہے تیری آواز کو

لیلیٰ شب کھولتی ہے آکے جب زلفِ رسا — دامنِ دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلم ہو فدا — وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا

کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

وہ اُچھالی بچۂ قدرت نے گیند اک نور کی — جھانکتا ہے وہ درختوں کے پرے خورشید بھی
دل لگی کرتی ہے پتّے سے جسکی روشنی — میرے کانوں میں صدا آئی مگر کچھ دور کی

دل کی تاریکی میں وہ خورشید جان افروز ہے
شمعِ ہستی جس کی کرنوں سے ضیا اندوز ہے

وہ اصولِ[1] حق نمائے نقشِ ہستی کی صدا — روح کو ملتی ہے جس سے لذتِ آبِ بقا
جس سے پردہ ہوئے قانونِ محبت کا اُٹھا — جس نے انساں کو دیا رازِ حقیقت کا پتا

تیرے دامن کی ہواؤں سے اُگا تھا یہ شجر
بیج جس کی ہند میں ہے چین و جاپان میں ثمر

تُو تو ہے مدت سے اپنی سرزمیں کا آشنا — کچھ بتا اُن رازدانانِ حقیقت کا پتا

---

[1] بدھ مذہب کی طرف اشارہ ہے۔

تیری خاموشی میں ہے عہدِ سلف کا ماجرا تیرے ہر ذرّے میں ہے کوہِ اُلمپس[1] کی فضا

ایک جلوہ تھا کلیمِ طورِ سینا کے لئے
تو تجلّی ہے سراپا چشمِ بینا کے لئے

اے ہمالہ داستاں اُس وقت کی کوئی سُنا مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن تیرا
کچھ بتا اُس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا داغ جس پہ غازۂ رنگِ تکلّف کا نہ تھا

ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایّام تو

آنکھ اے دل کھول اور نظارۂ قدرت کو دیکھ اِس فضا کو اِس گل و گلزار کی رنگت کو دیکھ
اپنی پستی دیکھ اور اس کوہ کی رفعت کو دیکھ اس خموشی میں سرورِ گوشۂ عزلت کو دیکھ

شاہدِ مطلب ملے جس سے وہ ساماں ہے یہی
دردِ دل جاتا رہے جس سے وہ درماں ہے یہی ([illegible])

---

[1] کوہ اُلمپس۔ یونان میں ایک مشہور پہاڑ ہے جس پہ قدیم یونانی خیالات کے مطابق دیوتاؤں کے دربار ہوتے تھے۔

جوگی

کل صبح کے مطلعِ تاباں سے جب عالم بقعۂ نور ہُوا
سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا
مستانہ ہوائے گلشن تھی جانانہ ادائے گلبن تھی
ہر وادی وادیِ ایمن تھی ہر کوہ پہ جلوۂ طور ہُوا
جب بادِ صبا مضراب بنی ہر شاخِ نہال رباب بنی
شمشاد و چنار ستار بنے ہر سرو و سمن طنبور ہُوا
سب طائر مل کر گانے لگے عرفان کی تانیں اُڑانے لگے
اشجار بھی وجد میں آنے لگے گلشن وہ سماعِ طیور ہُوا
سبزے نے بساط بچھائی تھی اور بزمِ سرور سجائی تھی
بن میں گلشن میں آنگن میں فرشِ سنجاب و سمور ہُوا
تھا دل کش منظرِ دشت و جبل اور چال صبا کی مستانہ
اس حال میں ایک پہاڑی پر جا نکلا ناظرِ دیوانہ

چیلوں نے جھنڈے گاڑے تھے پربت پر چھاؤنی چھائی تھی
تھے خیمے ڈیرے بادل کے کہرے نے قنات لگائی تھی
یہاں برف کے تودے گلتے تھے چاندی کے فوارے چلتے تھے
چشمے سیماب اُگلتے تھے نالوں نے دھوم مچائی تھی
یہاں قلۂ کوہ پہ رہتا تھا اک مست قلندر بیراگی
تھی راکھ جٹوں میں جوگی کے اور انگ بھبوت رمائی تھی

تھا راکھ کا جوگی کا بستر اور راکھ کا پیراہن تن پر
تھی ایک لنگوٹی زیب کمر جو گھٹنوں تک لٹکائی تھی
سب خلق خدا سے بیگانہ وہ مست قلندر دیوانہ
بیٹھا تھا جوگی مستانہ آنکھوں میں مستی چھائی تھی
جوگی سے آنکھیں چار ہوئیں اور جھک کر ہم نے سلام کیا
تب آنکھ اٹھا کر ناظر سے یوں بن باسی نے کلام کیا
کیوں بابا ناحق جوگی کو تم کس لئے آ کے ستاتے ہو
ہیں پنکھ پکھیرو بن باسی تم جال میں آن پھنساتے ہو
کوئی جھگڑا دال چپاتی کا کوئی دعوےٰ گھوڑے ہاتھی کا
کوئی شکوہ سنگی ساتھی کا تم ہم کو سنانے آتے ہو
ہم حرص و ہوا کو چھوڑ چکے اس نگری سے منہ موڑ چکے
ہم جو زنجیریں توڑ چکے تم لا کے وہی پہناتے ہو
تم پوجا کرتے ہو دھن کی ہم سیوا کرتے ہیں ساجن کی
ہم جوت جگاتے ہیں من کی تم اس کو آ کے بجھاتے ہو
سنسار سے یہاں مکھ پھیرا ہے من میں ساجن کا ڈیرا ہے
یہاں آنکھ لڑائی ہے پیتم سے تم کس سے آنکھ ملاتے ہو
اس مست قلندر جوگی نے جب ناظر پر یہ عتاب کیا
کچھ دیر تو ہم خاموش رہے پھر جوگی سے یہ خطاب کیا
ہیں ہم پردیسی سیلانی مت ناحق طیش میں آ جوگی
ہم آئے تھے تیرے درشن کو چتون پر میل نہ لا جوگی
آبادی سے منہ پھیرا کیوں پربت میں کیا ہے ڈیرا کیوں
ہر محفل میں ہر منزل میں ہر دل میں ہے نورِ خدا جوگی
کیا مسجد میں کیا مندر میں سب جلوہ ہے وجہ اللہ کا

پربت بن نگر میں ساگر میں ہر اُترا ہے ہر جا جوگی
جی شہر میں خوب بہلتا ہے واں حسن پہ عشق مچلتا ہے
وہاں پریم کا ساغر چلتا ہے چل دل کی پیاس بجھا جوگی
وہاں دل کا غنچہ کھلتا ہے ہر رنگ میں موہن ملتا ہے
چل شہر میں سنکھ بجا جوگی بازار میں دھونی رما جوگی
ان چکنی چپڑی باتوں سے مت جوگی کو بہلا بابا
جو آگ بجھائی جتنوں سے پھر اُس پہ نہ تیل گرا بابا
ہے شہروں میں غل شور بہت اور حرص و ہوا کا زور بہت
بستے ہیں نگر میں چور بہت سادھوں کی ہے بن میں جا بابا
ہے شہر میں شورش نفسانی جنگل میں ہے جلوہ روحانی
ہے نگری ڈگری کثرت کی بن وحدت کا دریا بابا
ہم جنگل کے پھل کھاتے ہیں چشموں سے پیاس بجھاتے ہیں
راجا کے نہ دوارے جاتے ہیں پرجا کی نہیں پروا بابا
سر پہ آکاش کا منڈل ہے دھرتی پہ سہانی مخمل ہے
دن کو سورج کی محفل ہے شب کو تاروں کی سبھا بابا
جب جھوم کے یہاں گھن آتے ہیں مستی کا رنگ جماتے ہیں
چشمے طنبور بجاتے ہیں گاتی ہے ملار ہوا بابا
یاں پنچھی مل کر گاتے ہیں پیتم کے سندیس سناتے ہیں
یاں روپ انوپ دکھاتے ہیں ہر پھول اور برگ گیا بابا
ہے پیٹ کا ہر دم دھیان نہیں اور یاد نہیں بھگوان نہیں
سِل پتھر اینٹ مکان نہیں دیتے ہیں سکھی سے چھڑا بابا
تن من کو دھن میں لگاتے ہو پیتم کو دل سے بھلاتے ہو
ماٹی میں لعل گنواتے ہو تم بندۂ حرص و ہوا بابا

دھن دولت آنی جانی ہے یہ دنیا رام کہانی ہے
یہ عالم عالمِ فانی ہے باقی ہے ذاتِ خُدا بابا

چودھری خوشی محمد خاں ناظر از کشمیر

ندی کا راگ

بگلوں اور چھوؤں کے نشیمن سے میں نکلکر ناگاہاں — چشم زدن میں سیل بلا کی طرح جھپٹ کر آتی ہوں
سبزہ کی فرش استبرق پر مثل فراری غلطاں — کروٹیں لیتی ہوئی وادی میں پہنچکر شور مچاتی ہوں
کتنی گھاٹیوں کی دامن کو راہ میں آئی جھٹک کر میں — کتنے ٹیکروں اور ٹیلوں کے تلووں میں سہلاتی ہوں
بیسوں گاؤں اور قصبوں کی پہلو سے نکلی مٹک کر میں — سیکڑوں پل ہیں مٹھی میں دل جن کا چرا کر لاتی ہوں

زید کے کھیت کے نیچے بہہ کر تھوڑی سی دور پہ آخر کار
جا کے چھلکتے دریا کو میں شربت وصل پلاتی ہوں
عمرو زید کی ہستی ہی کیا ہے صبح آئے گئے شام سدھار
مجھ کو دیکھو کہ ایک روش پر صبح و مسا چلی جاتی ہوں

تان کھرج کی یا پنچم کی چھیڑتی ہوں بیخود ہو کر — ریزۂ سنگ سے تار آب پہ دلکش زخمہ لگاتی ہوں
پاؤں پہ جھانجھ بھنور کی پہنے اوڑھے افشاں کی چادر — چھم چھم کرتی ہوئی آپ اپنے حسن پہ میں اتراتی ہوں
بنکر میں مشاطہ کبھی الجھاتی ہوں گیسوے ساحل کو — کھیتوں کا دھو آتی منہ میدانوں کو نہلاتی ہوں
اور کبھی ساقی بنکے مرتب کرتی ہوں سبزہ کی محفل کو — ساغر نامیہ بھر کے بنفشہ اور سمن کو پلاتی ہوں

گاتی بجاتی جشن مناتی تھوڑی سی دور پہ آخر کار
جا کے چھلکتے دریا کو میں شربت وصل پلاتی ہوں
عمرو زید کی ہستی ہی کیا ہے صبح آئے گئے شام سدھار
مجھ کو دیکھو کہ ایک روش پر صبح و مسا چلی جاتی ہوں

زیب تن میں کر کے آب رواں کا پاک اور صاف لباس — ساحت ہاموں پر جسدم بل کھاتی ہوئی اٹھلاتی ہوں
اپنے آنچل میں بھر لاتی ہوں میں کہیں پھول اور کہیں گھاس — گود میں غنچے رو ہو کو کبھی جھینگے کو کبھی میں کھلاتی ہوں
کف کے عنبریں رنگ کے گالے مجھ پہ کہیں ہیں تیر رہے — مارتی ہوں میں حباب کو گاہے اور کبھی اسکو جلاتی ہوں

لوٹتے لوٹتے رستہ میں بستر پہ سنہری کنکروں کے میں ٹکرا کے کسی پتھر سے روپہلی چھینٹیں اڑاتی ہوں

بہتی بہتی بس اس انداز سے تھوڑی سی دور پہ آخرکار
جا کے چھلکتے دریا کو میں شربت وصل پلاتی ہوں
عمرو زید کی ہستی ہی کیا ہے صبح آئے گئے شام سدھا
مجھ کو دیکھو کہ ایک روش پہ صبح و مسا چلی جاتی ہوں

اڑتی ابابیلوں کے ساتھ زیر و بم میں اڑاتی ہوں
میں کبھی پھسلی اور کبھی رپٹی اور کبھی آنکھ لڑاتی ہوں
سورج کی کرنوں کو اپنے ریت کے ٹاپوؤں پہ بہم
رقص میں لا کر زہرہ کو افلاک پہ میں شرماتی ہوں
دشت نوردی بادیہ گردی کرتی اک انداز سے میں
سبزۂ تر کو چھیڑتی ہوں اور بید کو میں لہراتی ہوں
لالہ و سنبل کو جو مظاہر عاشق اور معشوق کے ہیں
میٹھی نیند سے گدگدی لے کے چلتے چلتے جگاتی ہوں
جھاڑوں میں جھنکار دیں صحرا میں ویرانوں میں سدا
چاند کو اور تاروں کو میں اپنا میٹھا راگ سناتی ہوں
اپنے ریت کے بنڈوں میں کچھ دیر کو لیتی ہوں ستا
اپنے کنارہ کی بوٹیوں سے دم بھر کو میں دل بہلاتی ہوں

کاٹتی ہوں اک چکر پھر اور تھوڑی سی دور پہ آخرکار
جا کے چھلکتے دریا کو میں شربت وصل پلاتی ہوں
عمرو زید کی ہستی ہی کیا ہے صبح آئے گئے شام سدھار
مجھ کو دیکھو کہ ایک روش پہ صبح و مسا چلی جاتی ہوں

ظفر علی خاں بی۔ اے

شکایت زمانہ

مبارک اہلِ ہنر کو فراغ نوحہ گری
کہ شمع بزمِ طرب ہے فروغ بے ہنری

اگرچہ داخلِ طبعِ جہاں ہے کونِ فساد
مگر زمانہ کی نیت فساد سے نہ بھری

مزاجِ دہر کو یہ ضد ہے چارہ جوئی سے
کہ دستِ سعی رفوگر ہے صرف جامہ دری

چمن میں اب کے یہ کیسی بہار آئی ہے
نہ کوئی پھول شگفتہ نہ کوئی شاخ ہری

چمن کی سیر مبارک فراغ بالوں کو
ہمیں قفس میں مزا دے گئی شکستہ پری

دعا سے ہاتھ اُٹھاتے ہیں آدل مایوس
کہ ناگوار طبیعت سے ننگ بے اثری

اگرچہ دہر نے کھائے ہزار ہا چکر
سر فلک سے نہ نکلی ہنوز خیرہ سری

زمانہ بسکہ نئی چال روز چلتا ہے
نہ بھول جائے کہیں اپنی چال کبک دری

ہم اپنے دل کی لگی پر جو روئے بھی تو کیا
بجھا سکے گی نہ یہ آگ آنسوؤں کی تری

نمودِ حشر ہے اے بختِ خفتہ ہو بیدار
غضب خدا کا ابھی تک نہ تیری نیند بھری

جگا کے تھک گئی عبرت بھی خوابِ غفلت سے
مگر نہ چونکے ہم اس پر بھی اُف رے بیخبری

دکھایا جہل نے تحقیق کا اثر اُلٹا
مقدمات بدیہی بھی ہو گئے نظری

محیط ہم پہ ہے یوں تیرگی جہالت کی
کہ ظلمتِ شبِ غم ہے سپیدۂ سحری

بشر کے سر ہے رسوم و قیود کا وہ بار
جسے اُٹھا نہیں سکتی ہے طاقتِ بشری

ہمیں گناہ پہ مجبور کرتی ہے عادت
اگرچہ فطرتِ انساں ہے معصیت سے بری

زمانہ بھر سے بُرے ہو گئے ہمیں اے قوم
بُرا نہ مان جو کہنا ہو کوئی بات کھری

یہ کیا کہ علم میں ہم اور سب سے ہار گئے
جو ہیں شجاع کبھی بولتے نہیں وہ ہری

اگرچہ جُبن ہیں ضرب المثل نہیں لیکن
حقیقتاً جو نظر کی تو ہم نہیں ہیں جری

ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے جس کو علم
نہ حکمتِ عملی ہے نہ حکمتِ نظری

ذلیل سمجھے ہیں ہم حرفت و صناعت کو — ہماری شان کے لائق نہیں ہے پیشہ وری
اگرچہ قوت ایجاد سے رہے محروم — نکالتے ہیں نئی روز طرزِ گدیہ گری
بری ہے ننگ حمایت سے ذات اہل کمال — مسیح کو نہیں پروائے رنج بے پدری
ملی ہے خوبیٔ قسمت سے ہمّت عالی — گداگری میں بھی ہے ہم کو زعم تاجوری

ادیب ہم بھی ہیں مرزا کہ آج علم ادب
نہیں ہے کچھ مگر افسانہ ہائے دیو و پری

تصویرِ عبرت

بزمِ[۱] اک لاہور میں ہے خادمانِ قوم کی
جنکے دل سے لگ رہی ہے فکر شانِ قوم کی

رات دن سرگرم ہیں سب اسی کوشش میں ہیں
جسطرح سے بن پڑے اسلام کی خدمت کریں

حسرتِ بیدل بھی اب کے شاملِ محفل ہوا
رنگ محفل سے سرورِ بیکراں حاصل ہوا

بلبلانِ قوم کے جب چہچہے سب سُن لئے
شہر خاموشاں میں جا نکلا میں عبرت کیلئے

پھرتے پھرتے مرقدِ نورجہاں آیا نظر
مقبرہ تھا وہ کہ تھا تصویرِ عبرت سربسر

کل تھا جس کی شان پہ عالم کا دل آیا ہوا
آج عالم بیکسی کا اُس پہ ہے چھایا ہوا

جس کے رتھ کو ہانکتا تھا بادشاہِ روزگار
گردشِ گردوں سے یوں تاراج ہو اُسکا مزار

چوٹ سی دل پر لگی۔ اُجڑی وہ حالت دیکھ کر
جان ہی پہ آ بنی۔ بگڑی وہ صورت دیکھ کر

دل کی آنکھیں کھل گئیں غفلت کا پردہ اُٹھ گیا
بیخودی نے مجھکو دکھلایا تماشا اک نیا

شکل اِک آئی نظر استادہ بافرِّ شہی
جو عجب حسرت سے روضہ کیطرف تھی دیکھتی

اُسکی پیشانی سے رعبِ سلطنت تھا جلوہ گر
اُسکی چتون سے برستا تھا غضب کا کرّوفر

دل نے آہستہ کہا یہ ہے جہانگیرِ غیور
مقبرہ میں سونیوالی اُسکے دل کی تھی سرور

دیر تک تو ضبطِ بیتابیِ دل کرتی رہی
جوشِ بیتابی سے وہ مجبور آخر ہو گئی

آہ کھینچی ایک اُس نے بادلِ اندوہگین
یوں کیا اظہارِ دردِ دل باوازِ حزیں

کیا اُسی بیگم کا یہ ہے خوار خستہ مقبرا
برسوں ڈنکا جس کا ملکِ ہند میں بجتا رہا

میں نے جس کے سر پہ قرباں چترِ شاہی کر دیا
جس کی جوتی کے تلے اورنگِ شاہی دھر دیا

جسکے قدموں پہ فدا کر دی تھی میں نے سلطنت
جسکے آگے سر جھکا دیتے تھے اہلِ تمکنت

جس کی صورت جلوۂ فردوس کی تصویر تھی
جس کی رنگینی بہارِ خطۂ کشمیر تھی

---

[۱] انجمن حمایت اسلام لاہور

آہ وہ ایامِ عشرت اور وہ لیل و نہار — بلبلِ آملی چہکتا دیکھ کر جن کی بہار
جسکی رنگیں بزم رشکِ روضۂ فردوس تھی — بیکسی سے اُسکے روضہ کی ہے کیا صورت بنی
ظالموں نے قبر کا تعویذ تک چھوڑا نہیں — کون سا گوشہ ہے تربت کا کہ جو توڑا نہیں
بذلہ سنجی سے خجل ہوتی تھی جسکے پھلجھڑی — حیف وہ خاموش آغوشِ لحد میں ہے پڑی
قصر میں بچھتا تھا جسکے فرشِ دیبا و حریر — آہ فرشِ خاک پر سوتی ہے وہ ماہِ منیر
جمگھٹے میں نازنینوں کے جو کرتی تھی بسر — آہ اُس کی قبر پر اب بیکسی ہے نوحہ گر
سیج پر پھولوں کے سوتی تھی کبھی جو نازنیں — ہائے اُسکی قبر پر اک پنکھڑی تک بھی نہیں
جسکی پابوسی کی کرتے آرزو گلہائے تر — خشک کانٹوں کا پڑا ہے ڈھیر اُسکی گور پر
حُسن جس کا تازگی بخشِ گل و گلزار تھا — آہ قسمت میں لکھا اُس کی لحد کا خار تھا
قصر میں جلتی تھیں جس کے شمعہائے عنبریں — حیف روشن اک دیا بھی قبر پر اُس کی نہیں
نام روشن ہے جہاں میں آہ جن کا سر بسر — نام کو بھی روشنی آئے نہ اُس کی قبر پر
کر دیئے جس نے بہت سے صاحبِ طبل و نشاں — اُس شکستہ مقبرہ میں وہ پڑی ہے بے نشاں
جسنے صدہا خلعتِ دیبا و اطلس دے دیئے — حیف ترسے اُس کی تربت ایک چادر کے لئے
لونڈیوں کی جسکی تھی پوشاک کل زربفت کی — آج دیواریں ہیں اُسکے روضہ کی ننگی کھڑی
اتنا کہہ کر ہو گئی خاموش دم بھر کے لئے — تیکھی چتون سے ادا پھر اُسنے یہ کلمے کئے
ما تا مرقد پر نشانِ لوح بھی پیدا نہیں — نقشِ نامِ نیک لوحِ دل سے مٹ سکتا نہیں
نیکناموں کے نشاں باقی رہینگے حشر تک — کیا ہوا گر دورِ گردوں نے مٹا دی قبر تک

گر نہیں ہے گور پر اُس کے دیا تو کیا ہوا
ہے جہاں میں نور اُس کے نام کا پھیلا ہوا

حسرت شروانی

۱؎ مراد ملک الشعراء طالب آملی۔
۲؎ جب راقم نے نور جہاں کی قبر دیکھی تو اس پر ببول کے کانٹوں کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔

کمالِ نقص

میں تو بے شبہہ ہوں سراپا نقص — دیکھیں اہلِ کمال اپنا نقص

ماہِ کامل میں ہے کلف کا عیب — مہرِ روشن میں ہے گہن کا نقص

ذرّہ ذرّہ ہے صاف صاف عیاں — ایک پر ایک کا ہے بالا نقص

چار دن کی ہے چاندنی کی بہار — صاف روشن ہے جیسے تارا نقص

ہاتھ کا میل زر کو کہتے ہیں — بے زری کا ہے آشکارا نقص

روزِ روشن کے واسطے شبِ تار — روشنی کے لئے اندھیرا نقص

داغِ افلاس مفلسوں کے لئے — اہلِ دولت کو زر کا توڑا نقص

ہے عجب دھوپ چھاؤں کا عالم — ہنر اِس کا جو ہے وہ اُس کا نقص

ناز کی عیب پہلوانوں کا — پہلوانی پری رخوں کا نقص

حُسن بے ناز بے نمک یکسر — ناز بے حسن انتہا کا نقص

خامشی بے سبب سراسر عیب — سخن بے محل سراپا نقص

زندگی سے جہاں میں سب کچھ ہے — اس کو بھی ہے اجل کا کھٹکا نقص

نشے کو بھی خمار لازم ہے — عیش کا ہے یہ حیرت افزا نقص

جرم کا ہے جواہرات پہ جرم — جوہری پر یہ ہے ہویدا نقص

ہے ہنر کو کسادیِ بازار — کس غضب کا یہ ہے خدایا نقص

علم سے قدرِ اہلِ علم و ہنر — اِس کو ہے مال کا نہ ہونا نقص

سود کو ہیں زیاں کے سو کھڑاگ — نفع کے واسطے ہے گھاٹا نقص

فتح کو ہے شکست کا دھڑکا — رنج کا ہے خوشی میں آنا نقص

دولتیں سب کی سب زوال پذیر — ہائے پیشِ نظر ہیں کب کیا نقص

اس جہاں میں ثبات ہے کس کو — بے ثباتی بھلا ہے کم کیا نقص
گل بے خار اس چمن میں نہیں — پھول کے واسطے ہے کانٹا نقص
کہیں اِس کے خلاف ہو تو ہے شاذ — شاذ ہونا ہی کیا ہے تھوڑا نقص
آدمی کی خطا سے ہے ترکیب — ڈھونڈھتا ہی ہے اُس کا بیجا نقص
نارسا ذہن ناتمام خیال — عقل ناقص ہے اس کا پیدا نقص
کوئی نقصان سے نہیں خالی — کہیں اُتنا کہیں ہے اِتنا نقص
ہاں مگر ذاتِ واحدِ مطلق — جس میں حقّا نہیں ہے اصلا نقص
لیکن اے دوست امر حق ہے یہی — نقص پر ہے نگاہ کرنا نقص
اولاً ہو گی یہ غلط بینی — کیونکہ وہ کم ہے یا زیادہ نقص
سب ہیں مخلوق خالقِ مطلق — اس کی خلقت میں کچھ دکھانا نقص
نقصِ خلّاق ہے معاذاللہ — کیوں۔کہ ناقص ہی سے ہویدا نقص
ثانیاً نقص ہے دلیل کمال — کہ۔اگر مجھ میں کچھ نہ ہوتا نقص
قدرِ اہل کمال کیا ہوتی!! — بے حقیقت نہیں یہ میرا نقص
ایک فرقِ مجاز ہے ورنہ — کیسا نقصان اور کہاں کا نقص

ناقص آزاد پر نظر کیوں ہے
آپ کا یہ کمال ہے یہ نقص

حافظ سید فضل حق آزاد

آغازِ محبت

یاد ہیں وہ سارے عیش بافراغت کے مزے — دل ابھی بھولا نہیں آغازِ الفت کے مزے
وہ سراپا ناز تھا بیگانۂ رسمِ جفا — اور مجھے حاصل تھے لطفِ بے نہایت کے مزے
حسن سے اپنے وہ غافل تھا میں اپنے عشق سے — اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے
میری جانب سے نگاہ شوق کی گستاخیاں — یار کی جانب سے آغازِ شرارت کے مزے
یاد ہیں وہ حسن و الفت کی نرالی شوخیاں — التماسِ عذر تمہیدِ شکایت کے مزے
جلوہ ہستی فزائے دلربا کی لذتیں — بیخودی ہائے دلِ مخمور حیرت کے مزے
یاد ہیں وہ آرزو ہائے لقائے یار ہیں — کشمکش ہائے شبِ تاریک فرقت کے مزے
شوق عرض آرزو کے وہ نرالے ولولے — فکرِ مضمون ہائے عنوانِ کنایت کے مزے
یاد ہیں وہ انتظارِ نامہ محبوب ہیں — بیقراری ہائے ناکام طبیعت کے مزے
صحتیں لاکھوں مری بیماری غم پر نثار — جسمیں اٹھے بار ہا انکی عیادت کے مزے
وہ زمانہ بھی غرض تھا کیا زمانہ لطف کا — دلکو جب حاصل تھے سارے عیش و عشرت کے مزے

لیک حسرت اس تغافل کیش کی بیداد نے
بدلے سب محرومیوں سے وہ محبت کے مزے

حسرت موہانی

انجامِ محبت

(حرماں نصیب گلیٹ[1] زبانِ حال سے)

مجھ سے پوچھے کوئی انجامِ محبت کے مزے
بادۂ حرماں کی لذت جامِ حسرت کے مزے

مجھ پہ احسان کر گئی وعدہ فراموشی تری
بے وفائی نے ہی کھلائے شہادت کے مزے

کوہکن بھی داستاں کو میری سُنکر بول اُٹھے
کاہے کو چکھے تھے میں نے یہ مصیبت کے مزے

گو سراپا آرزو تھا تب بھی پیمانِ وفا
پر ملے دھوکے میں بھی ہم کو حقیقت کے مزے

آہ اُمیدِ حصولِ مرہمِ مقصود میں
لوٹے ہیں کیا کیا مرے دل نے جراحت کے مزے

ذائقہ دردِ محبت کا تن آسانوں کو کیا
جانتے ہیں اہلِ ہمت ہی مصیبت کے مزے

بحرِ الفت میں تھا طوفانِ شدائد کا خطر
سب بُھلا دیتے تھے پر اُمیدِ راحت کے مزے

بے وفا یارِ ستم پیشہ اگر نکلا تو کیا
کم نہیں راہِ وفا میں استقامت کے مزے

جامِ وصلت سے نہیں کم مجھ سے حرماں دوست کو
یہ خمارِ نشۂ صہبائے الفت کے مزے

بوالہوس کو ہی مبارک وعدۂ الفت ترا
ہم اُٹھائینگے بس اب ایثارِ غیرت کے مزے

---

[1] مغرب کے لاثانی فسانہ نگار وکٹر ہیوگو کے فسانہ ٹوائلرز آف دی سی کو ختم کر کے راقم کے دل میں ان خیالات نے خود بخود ہجوم کیا۔ گلیٹ ایک حسینہ پر عاشق ہے اُس حسینہ کے چچا کا جہاز کہیں دور سمندر میں ٹوٹ کر غرق ہو گیا ہے یہ چچا ہی اس حسینہ کا سرپرست بلکہ بمنزلۂ پدر ہے۔ وہ حسینہ اور اُس کا چچا وعدہ کرتے ہیں کہ جو کوئی اس شکستہ جہاز کے انجن کو سمندر سے نکال لائے اُس سے اس حسینہ کی شادی ہو گلیٹ اس شرط کو منظور کر کے دو ماہ کی لاتعداد مصائب جھیل کر انجن کو تن تنہا نکال لاتا ہے۔ مگر اس اثنا میں وہ حسینہ اپنا دل ایک اور کو دے بیٹھی ہے۔ گلیٹ یہ دیکھ کر اپنے ہاتھ سے اپنے رقیب کی شادی اس حسینہ سے کرا کر خود سمندر میں ڈوب مرتا ہے۔

جان دینگے اب توفعرِ بحرِ ناکامی ہیں ہم　　پائینگے گمنامی مرقد میں شہرت کے مزے

چھوٹ گئے اُمیّد کے پھندوں سے اب نیرنگ ہم

یاس نے ہم کو دیئے عیش و مسرّت کے مزے

نیرنگ

گمنام نامور

نظر کر ذرا حالتِ بحر و بر پر
محل ہے یہ عبرت کا اے دل سراسر

ہزاروں ہیں لولوے شہوار ایسے
سمجھتے جنہیں لوگ ہنر سے بے ہنر

ہے آب اُن کی پر آب دریا میں پنہاں
تہ سطحِ تاریک قعرِ سمندر

عجائب ہیں نیرنگِ گلزارِ ہستی
زمیں نے کھلائے ہیں پھول ایسے اکثر

ہر اک گل سے اچھے ہیں جو رنگ و بو میں
لطافت ہے اُن کی کہ قدرت کا منظر

مگر ہیں وہ لوگوں کی نظروں سے پنہاں
کھلے اور وہیں گر پڑے خشک ہو کر

پڑے ہار بن کر گلے میں کسی کے
نہ لہرایا طرّہ ہے اُن کا سروں پر

شمیم اُن کی محدود جنگل میں کھٹکی
یہاں تک کہ غالب ہوئی بادِ صرصر

عنادل تھے ایسے بہت اس چمن میں
نوا سنجیوں میں نہیں جن کا ہمسر

جہانِ ادب جانِ اخلاق و حکمت
وہ خوش گو فصاحت کو ہو ناز جن پر

ہو فردوسی اُن کے گلستاں کا گلچیں
پھڑکنے لگے اشعری شعر سُن کر

خیالات روشن لئے ساتھ اپنے
چھپے جا کے تاریک قبروں کے اندر

نہیں جانتا نام بھی اُن کے کوئی
لحد ہو گئی ہے زمیں کے برابر

کسی وقت جا کر کرو غور اُن میں
مقابر ہیں جو اگلے قریوں کے باہر

تو پاؤ گے اُڑتے ہوئے ایسے ذرّے
ہیں جن میں نہاں فخرِ تیمور و بابر

اولوالعزم خوش فکر ہمدردِ ملّت
رئیسوں کے سرتاج شاہوں کے افسر

ملیں ہستیاں اُن کی یوں نیستی میں
سرابوں کو جیسے مٹاتی ہے صرصر

حبیب کنتوری

چمن کی سیر

غنچوں نے چٹکیوں میں مرا دل لبھا لیا — اے باغباں چمن میں ترے کیا بہار ہے
لالہ ہے یا کہ حسن کا ہے جل رہا دیا — اُڑتی ہے بو کہ جاتا ختن کا سوار ہے

ہنگامِ صبح سیرِ گلستاں بسا خوش است
بر شاخِ سبز بلبلِ شیریں نوا خوش است

سبزے کا ہے زمین پہ بچھا فرشِ مخملی — اور اس پہ ہیں چمک رہی پھولوں کی کیاریاں
ہاں پانیوں نے گویا بسحرِ ہنروری — فیروزہ پر عقیق ہے کہیں میناکاریاں

اے آسماں بگو بہ ملائک کہ دیدہ اند؟
منظر چنیں بہ خلدِ بریں یا شنیدہ اند؟

کس ناز کس ادا سے اُٹھی ہے نسیم۔ ہائے — آفت کی شوخی اور قیامت کی چال ہے
کہہ دو کہ بلبلوں کو نہ اب باغباں ستائے — شاخِ شجر تک آج چمن میں نہال ہے

مانندِ گل ز فیضِ صبا تازہ شد دلم
بادہ خورم بیادِ گل و غم غلط کنم

نہروں میں کس صفائی سے بہتا ہے آبِ صاف — آئینے ہیں یہ سرو و صنوبر کے واسطے
ہر لہر کی زباں سے یہ کہتا ہے آبِ صاف — روح و رواں ہوں میں ہی گلِ تر کے واسطے

چیزے کز و حیات شود بہرہ ور منم
در ابر جلوۂ من و در ہر شجر منم

شبیوں کے گیت گاتی ہیں سب طائرانِ باغ — شاخوں پہ پھول مستوں کی صورت ہیں جھومتے
ہو زیارت آج ہیں کیا زائرانِ باغ — اور جھک کے پاؤں شاہدِ گل کے ہیں چومتے

گل گفت بس خوش آمدم اہنگ نوائے تو
بلبل جواب داد۔ کہ جانم فدائے تو

کالی گھٹا چمن میں ہر اک سمت چھا گئی — موج ہوا پہ جھومنے لگی لینے بوئے گل
پھر آ کے اُنکے کان میں کچھ جو سنا گئی — اُڑ اُڑ کے بلبلیں چلی جاتی ہیں سوئے گل

از قاصد صبا چہ حکایت شنیدۂ
از من چرا تو بلبل شیدا بریدۂ

بجلی چمک کے چھپ گئی پھر کیوں سحاب میں — کیا کوئی دید حسن کے لائق نہ تھا یہاں
کب تک چھپے گا چہرہ یہ آخر نقاب میں — لو یک بہ یک پھر آپ کا جلوہ ہوا عیاں

حقا کہ برق حسن حسیناں شنیدہ ایم
ایں نور شعلۂ رخ رخشاں نہ دیدہ ایم

بجلی نہیں تجلی یزداں ہے ابر میں — اور یہ بھی محض عکس ہے اُس کے ظہور کا
جلوہ اُسی کا ظاہر و پنہاں ہے ابر میں — صد برق ایک قطرہ ہے دریائے نور کا

اے آفتاب ذرۂ مہر ضیائے تو
گستاخی تمام شد عزم ثنائے تو

بارش کی بوندیں گرنے لگیں آسمان سے — اے خضر اعطر دیکھ لے آب حیات کا
ہیرے نکل رہے ہیں یہ بادل کی کان سے — تاروں کی طرح چمکیں سماں ہو جو رات کا

اے ابر بر تو رحمت پروردگار باد
وز تو کوہ و دشت ہمیشہ بہار باد

بادل ہو گل ہو باغ ہو بلبل ہو شاخ گُل — ہو حرز جان و راحت دل میری ایک شے
قدرت کی خوبیوں پہ ہمیشہ رہے نظر — بس زندگی کا لطف ہمایوں اسی میں ہے

خوش باش اے چمن کہ مرا شاد کردۂ
ویرانہ بود خاطرم۔ آباد کردۂ۔

اعجاز دیکھ تو سہی یہاں کیا سماں ہے آج — نیرنگ آسمان و زمیں کا نیا ہے رنگ

اقبال تیری سحر بیانی کہاں ہے آج تا آنکہ ظر کمان فکر سے مارا یک دو خدنگ

از نغمہ ہائے دلکش ایں چار یار ما
پنجاب خوش نواست ہمایوں دیار ما

محمد شاہ دین

حالی

کوئی نہ تھا جو بنے ملکِ شعر کا والی   دکھائے جوہرِ فکرِ طبیعتِ عالی
پڑی تھی شاہدِ بزمِ سخن کی جا خالی   زمانہ دیر سے تھا منتظر ترا حالی
بیا کہ فرشِ رہت دیدہ ہائے مشتاقاں
نوائے نغمۂ نو جاں گداز غمناکاں

اُٹھا کے بربطِ بالینِ سعدیِ شیراز   پڑے ہوئے جسے گذرے تھے سالہائے دراز
گئے تھے جس کو بجانے کا بھول سب انداز   کچھ اس ادا سے ہوا اُس پہ تو ترانہ نواز
کہ آتے جاتے کو شیدا بنا لیا تو نے
فسوں سا خلقِ خدا پر چلا دیا تو نے

جگر نشیں ہیں ترے تیر نالۂ موزوں   تری نوائیں ہیں برقِ قرارِ صبر و سکوں
ہے زخمہ زخمہ پہ ایک ایک والہ و مفتوں   خمِ شراب میں ساقی نے گھول دی افیوں
کہ مستِ جامِ تو تنہا نہ مے گسار انند
"خرابِ بادۂ لعلِ تو ہوشیار انند"

ہیں حرف حرف میں تیرے چھپے ہوئے نشتر   ہیں لفظ لفظ میں گویا بجھے ہوئے خنجر
دِل اس کا چھیدتے ہیں چاٹتے ہیں اسکا جگر   ہوئی پکار کہ بزمِ طرب بنی محشر
"کسے نماند کہ دیگر بہ تیغِ ناز کشی"
"مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی"

صدائے رعد سے بھی تھے نہ چونکنے والے   شرابِ لذتِ خوابِ سحر کے متوالے
مگر اُٹھائے جگر دوز تو نے جب نالے   تو پڑ گئے دلِ فولاد میں بھی بُت خالے
زخویشتن شد و یک یک تپاں زجا برخاست

کہ شور صور سرافیل حالیا برخاست

ترا کلام ہے تفسیر درد اہل جہاں — ہے شرح راز حقیقت ہر ایک تیرا بیاں
شعاع مہر معانی ہے یہ ترا دیواں — ضیائے مردمک دیدۂ سخن داناں

ہمیشہ بزم میں باقی رہے گی ضو اس کی
رہے گی زندہ دلوں کے دلوں میں لو اسکی

غزل میں ہے وہ تصوف وہ سوز اور وہ گداز — ہے مست صوفی صافی و رند محرم راز
دکھایا اُردو میں حافظ کا ہو بہو انداز — بھرا ہے شیشۂ ہندی میں بادۂ شیراز

زلال چشمۂ حیواں ز خامہ ات بچکید
کہ روح در تن قوم فسردہ جاں بدمید

چمن میں طوطیِ ہندوستان ہے گرم سخن — کہاں ہے شورش آواز نالۂ بیرن
زبان ہند زبانِ جہاں اگر ہو جائے — تری نواؤں سے تسخیر بحر و بر ہو جائے

زمین شعر میں تازہ چمن لگائے ہیں — اور ان میں طرفہ مضامین کے گل کھلائے ہیں
نگاہ صادق مشتاق میں سمائے ہیں — ہزار طرح ہزاروں نے خار کھائے ہیں

نہ وہ رہیں گے زمانے میں اور نہ تو حالی
رہیں گے تیرے گلستاں میں رنگ و بو حالی

صادق علی خاں

رام کہانی

پہلے ہم بچّے تھے اک نادان تھے — بے نوا تھے بے سر و سامان تھے

کھیلنے کے ہاتھ سے مجبور تھے — رات دن کے کھیل میں مسرور تھے

پھر جوانی آئی تو آئی بہار — خوب دیکھی گردشِ لیل و نہار

بے سر و سامانیاں جاتی رہیں — اگلی آناکانیاں جاتی رہیں

مستیاں سوجھیں ہوس کی ٹھان لیں — ٹھان لیں جو کچھ کہ دل میں ٹھان لیں

جس نے ٹوکا بے تکلف کہہ دیا — آخرت تو آئے دیکھا جائے گا!

"ساقیا برخیز و دردہ جام را — خاک بر سر کن غمِ ایام را"

علم سیکھا اور ہی کچھ ہو گئے! — رات کے جاگے ہوئے تھے سو گئے

پھر نہ جاگے عمر بھر خواری ہوئی! — قبر میں لیٹے تو بیداری ہوئی

ایسی بیداری سے سونا خوب تھا! — اور اس سونے پہ رونا خوب تھا

"مردماں را سر بسر در خواب داں — گشت بیدار آنکہ او رفت از جہاں"

ایک ظاہر تھا نتیجا اور بھی — ایسے وسوسوں نے اوڑایا اور بھی

"واہ کیا کہتے ہیں چہرا دیکھئے — رحمتِ حق کا تماشا دیکھئے

اب تو ہر مسجد کے ممبر سج گئے — اور کیا حضرت کے ڈنکے بج گئے

آپ کو کوشش سے یہ رتبہ ملا — لَیسَ لِلّانسانِ اِلّا ما سعےٰ

مل گئی تقدیر بھی تدبیر سے — آدمی سونا بنا اکسیر سے

ماہرِ ہر علم حضرت ہی تو ہیں — ماحیِ تفسید و بدعت ہی تو ہیں

آپ کو سچّوں میں سچّا جانئے — جانئے اچھّوں کو اچھّا جانئے

ایسی باتوں سے بڑھا کبر و غرور — بڑھتے بڑھتے بڑھ گئے رستے سے دور
پہلے رحمت تھے تو زحمت ہو گئے — خضر سے گمراہِ اُمّت ہو گئے
ہو گئے سرمستِ صہبائے خودی — بیخودی میں کچھ نہ سوجھی دُور کی
جب ہوائے نفس میں رہنے لگے — آدمی کو آدمی کہنے لگے
خود پرستی کی طرح غفلت بڑھی — خود کو بھولے غیر سے اُلفت بڑھی
کاش ہم دلدار پر رکھتے نظر — "اعتمادے نیست بر علم و ہنر"

جب ہوئی اس ابتدا کی انتہا — ہو گئی اس انتہا کی ابتدا
اُنگلیاں اُٹھیں تماشا ہو گئے — چار سو عالم میں رسوا ہو گئے
ایک نے بڑھ کر کہا حضرت یہ کیا؟ — آپ ہی ہیں ہادیِ اُمّت یہ کیا؟
خود کو بھولے اور خودی میں آ گئے — مُنہ بھی یوں آئے کہ مُنہ کی کھا گئے
آپ اپنی ذات سے ماہر نہیں — بات جو مخفی ہے وہ ظاہر نہیں
"مولوی گشتی و آگاہ نیستی — خود کجائی از کجائی کیستی
معرفت کیا چیز ہے فرمائیے؟ — آپ سمجھے ہیں تو کچھ سمجھائیے؟
ایں روا آں ناروا دانی تو نیک — تو روا یا ناروائی بیں تو نیک
تو نمیدانی یجوز و لایجوز را — خود نمیدانی کہ حوری یا عجوز را"

مرگ کے ظاہر نشاں ہونے لگے — تیر سے حضرت کماں ہونے لگے
پر نہ سمجھے آپ کو یہ کیا ہوا! — آپ کا کہنا مرا کہنا ہوا!
عَلَم کے دنیا میں جھنڈے گڑ گئے — پھر بھی تو لینے کے دینے پڑ گئے
"صد ہزاراں علم دارد از علوم — جانِ خود را خود نداند ایں ظلوم"

داغ دو دکھائے ہیں رونا ایک ہے — آنکھ کا ہونا نہ ہونا ایک ہے
اے بسا عالم ز دانش بے نصیب — حافظ علم است آنکس نے حبیب
ہائے سب منطق کا جھگڑا ہیچ ہے — ہیچ ہے صغریٰ و کبریٰ ہیچ ہے
عمر در محمول و در موضوع رفت — بے بصیرت عمر در مسموع رفت
زندگی صُغریٰ ہے کبریٰ ہے ممات — حدِ اوسط ہے عذابوں سے نجات
رہ گیا باقی نتیجہ "وصل دوست — "مہر دو عالم یک فروغِ روئے اوست

معرفت کے "لفظ" نے سمجھا دیا — اِک خودی گم ہو تو مل جائے خدا
گھر سے نکلو نکل دیکھو راہ کی — معرفت ہے نفس سے اللہ کی

خود کو پہچانو تو اُس کو جان لو
مان لو اے آہؔ کہنا مان لو

ابو نصر آہؔ دہلوی

خوابِ راحت

پھول ہی پھول اس پہ برساؤ آنکھ سے اشکِ خوں نہ ٹپکاؤ
پھول ہی پھول اس پہ برساؤ ذکرِ گور و کفن کا مت لاؤ
خوابِ راحت میں یہ تو سوتی ہے نیند یہ کب نصیب ہوتی ہے
جب زلیخا نے اس کا خط پایا خوابِ یوسف میں پھر نہ لطف آیا

کاش مجھ کو بھی چین یوں مل جائے
دلِ بیتاب کو سکوں مل جائے

اس سے اہلِ نشاط خورم تھے ہر گھڑی خندہ تبسم تھے
اس نے ہنس ہنس کے اُن کو یاد کیا نامرادوں کو بامراد کیا
اس نے پھولوں کے کر دیئے انبار اس نے دنیا کو کر دیا گلزار
خستہ دل تھی مگر یہ بیچاری زندگی سے بہت تھکی ہاری

سو گئی ہے جواب یہ زار و نزار
ہو گئے سب کنارہ کش یک بار

عمر سب صرفِ پیچ و تاب رہی ہائے کیا زندگی خراب رہی
دل میں اک کشمکش مدام رہی ایک چکر میں صبح و شام رہی
اس سے غافل طرب پرست رہے خندۂ ظاہری پہ مست رہے
ماندۂ رنجِ راہِ ہستی تھی عافیت کو سدا ترستی تھی

اب یہ آغوشِ عافیت میں ہے
عافیت خوب عافیت میں ہے

طائرِ روح آسماں پرواز کس طرح لائے تابِ قیدِ دراز

(قفس تنگ ہے بلا ہونا سانس گھٹتا ہے دم خفا ہونا)
چھوڑ کر جسم کو روانہ ہوا اور مرض کا تو اِک بہانہ ہوا
قید غم سے ہوئی ہے یہ آزاد وسعتِ عالم بقا میں شاد
خلد میں اب یہ راج کرتی ہے
خلق یاد اس کو آج کرتی ہے

مرزا اعجاز حسین۔ بی۔ اے

جلوۂ دربار

(تصوّر کی آنکھ سے)

سر میں شوق کا سودا دیکھا
دہلی کو ہم نے بھی جا دیکھا
جو کچھ دیکھا اچھا دیکھا
کیا بتلائیں کیا کیا دیکھا
نظم ہے مجھ کو بادۂ صافی
شغل بھی ہے دل کو کافی
مانگتا ہوں یاروں سے معافی
خیر اب دیکھئے لطف توافی
جمنا جی کے پاٹ کو دیکھا
اچھے ستھرے گھاٹ کو دیکھا
سب سے اونچے لاٹ کو دیکھا
حضرت ڈیوک کناٹ کو دیکھا
پلٹن اور رسالے دیکھے
گورے دیکھے کالے دیکھے
سنگینیں اور بھالے دیکھے
بینڈ بجانے والے دیکھے
خیموں کا اک جنگل دیکھا
اس جنگل میں منگل دیکھا
برہما اور ورنگل دیکھا
عزّت خواہوں کا دنگل دیکھا
سڑکیں تھیں ہر کمپ سے جاری
پانی تھا ہر پمپ سے جاری
نور کی موجیں لمپ سے جاری
تیزی تھی ہر جمپ سے جاری
کچھ چہروں پر مردی دیکھی
کچھ چہروں پر زردی دیکھی
اچھی خاصی سردی دیکھی
محفل میں سارنگی دیکھی
بیرنگی بارنگی دیکھی
دہر کی رنگا رنگی دیکھی
اچھے اچھوں کو بھٹکا دیکھا
بھیڑ میں کھاتے جھٹکا دیکھا
منہ کو اگرچہ لٹکا دیکھا
دل دربار سے اٹکا دیکھا
ہاتھی دیکھے بھاری بھرکم
اُن کا چلنا کم کم تھم تھم

زرّیں جھولیں نور کا عالم
میلوں تک وہ چم چم چم چم

پُر تھا پہلوئے مسجد لامع
روشنیاں تھیں ہر سو لامع

کوئی نہیں تھا کسی کا سامع
سب کے سب تھے دید کے طامع

سُرخی سڑک پہ کُٹتی دیکھی
سانس بھی بھیڑ میں گھٹتی دیکھی

آتشبازی چھٹتی دیکھی
لطف کی دولت لٹتی دیکھی

چوکی اک جو لکھی دیکھی
خوب ہی چکھی پکھی دیکھی

ہر سو نعمت رکھی دیکھی
شہد اور دودھ کی مکھی دیکھی

ایک کا حصّہ من و سلوا
ایک کا حصّہ تھوڑا سا حلوا

ایک کا حصّہ بھیڑ اور بلوا
میرا حصّہ دور کا جلوا

اوج برٹش راج کا دیکھا
پرتو تخت و تاج کا دیکھا

رنگ زمانہ آج کا دیکھا
رُخ کرزن مہاراج کا دیکھا

پہنچے پھاند کے سات سمندر
تحت میں اُنکے بیسوں بندر

حکمت و دانش اُن کے اندر
اپنی جگہ ہر ایک سکندر

اوج بخت ملاقی اُن کا
چرخ ہفت طباقی اُن کا

محفل اُن کی ساقی اُن کا
آنکھیں میری باقی اُن کا

ہم تو اُن کے خیر طلب ہیں
ہم کیا ایسے ہی سب کے سب ہیں

اُنکے راج کے عمدہ ڈھب ہیں
سب سامانِ عیش و طرب ہیں

اگزبشن کی شان انوکھی
ہر شے عمدہ ہر شے چوکھی

اقلیدس کی ناپی جوکھی
من بھر سونے کی لاگت سوکھی

جشنِ عظیم اس سال ہوا ہے
شاہی فورٹ میں بال ہوا ہے

روشن ہر اِک ہال ہوا ہے
قصّۂ ماضی حال ہوا ہے

ہے مشہورِ کوچہ و برزن
بال میں ناچیں لیڈی کرزن

طائرِ ہوش تھے سب کے پرزن
رشک سے دیکھ رہی تھی ہر زن

ہال بھی جھکیں آکے یکایک — زریں تھی پوشاک جھکا جھک
محو تھا اُن کا اوج سما تک — چرخ پہ زہرہ اُنکی تھی گاہک
گو نہ فاصلہ اوج فلک تھی — اس میں کہاں یہ نوک پلک تھی
اندر کی محفل کی جھلک تھی — بزم عشرت صبح تلک تھی
کی ہے بندش ذہن رسا نے — کوئی ملنے خواہ نہ مانے
سنتے ہیں ہم تو یہ فسانے — جس نے دیکھا ہو وہ جانے

سید اکبر حسین اکبرؔ

ہمّت و تدبیر

ایک مناظرہ

تدبیر یہ ہمّت سے لگی کہنے بہ تکرار — میں صاحبِ خانہ ہوں تو ہے میری پرستار
ہمّت نے کہا اُس سے کہ بیہودہ نہ جھک مار — حامی ہے خدا[۲] میرا نہ کر مجھ سے یہ گفتار
میں وہ ہوں کہ ہر ملک کو تسخیر کیا ہے
کی جس پہ نظر صاحبِ توقیر کیا ہے

انسانوں سے دُنیا کا سفر میں نے کرایا — ہر منزلِ دشوار کو آسان بنایا
بخشا شہ جمجاہ کا نادار کو پایا — کر کر کے غلاموں کو شہنشاہ دکھایا
مانندِ پرِ کاہ بہت کوہ ہیں کاٹے
میدانوں میں انبوہ کے انبوہ ہیں کاٹے

جا پوچھ کلمبس سے روائت کہ میں کیا ہوں — پڑھ لارڈ کلایو کی حکایت کہ میں کیا ہوں
یا حال نکلسن[۱] سے ہدایت کہ میں کیا ہوں — اللہ[۲] کی شاہد ہے حمائت کہ میں کیا ہوں
آنکھیں کھُلیں گر مجھ کو بوناپاٹ[۳] سے پوچھے
معلوم ہو میں کیا ہوں جو لاکھاٹ[۴] سے پوچھے

کیا شان ہے میری کوئی یونان سے پوچھے — روم و عرب و بربر و ایران سے پوچھے
رتبہ مرا تاتار سے توران سے پوچھے — ہاں میری حقیقت کوئی جاپان سے پوچھے

۱؎ جنرل جان نکلسن ۱۲

۲؎ ہمّت کا حامی خدا مشہور ضرب المثل ہے ۱۲

۳؎ نپولین بوناپاٹ شہنشاہ فرانس ۱۲

۴؎ جنرل سر ولیم لاکھارٹ (سابق) سپہ سالار افواجِ ہندوستان (کمانڈر ان چیف)

شاہانِ جہاں غیرتِ جمشید کئے ہیں
رستم سے بہت زندۂ جاوید کئے ہیں

چنگیز[۱] کی اولاد میں ایران میں پہنچی — تا نادر[۲] ہوئی مغلوں کے شبستان میں پہنچی
واں فتح تھی جس جنگ کے میدان میں پہنچی — آزاد تھے قیدی جو میں زندان میں پہنچی

محمود[۳] کا بہروپ بھرا ہند پہ آئی
اسکندرِ اعظم کو اٹھا سندھ پہ لائی

نصرانیوں سے بیتِ مقدس کو چھڑایا — پسپا کیا عاجز کیا اور نیچا دکھایا
توحید کا نقارہ سرِ رزم بجایا — شقہ علمِ دینِ محمدؐ کا اڑایا

کیا اپنی زباں سے کہوں جمہور سے سن لے
بابر سے ہمایوں سے کہ تیمور سے سن لے

لونڈی مجھے اللہ کی شان آپ بنائیں — توہیں کریں طعنے دیں صلواتیں سنائیں
احساں جو کئے میں نے وہ سب دل سے بھلائیں — اور درپئے تخریب ہوں در پردہ ستائیں

جو میں نہ یہاں ہوتی تو ۔ تو چیز ہی کیا تھی
دنیا میں تجھے رہنے کی تمیز ہی کیا تھی

تدبیر رجزخوانیاں ہمت کی یہ سنکر — بولی کہ میں ہوں خادمہ تم ہو مری افسر
ارشاد جو تم نے کیا ہو اس سے بھی برتر — سن لیجئے پر عرض مری کان لگا کر

یہ مانا کہ دنیا میں ضرورت ہے تمہاری
پر ساتھ ہی رہتی ہے ہماری بھی سواری

کہئے تو سہی آپ کہاں پہنچیں اکیلی — حاضر نہ تھی خاتوں کی کس جا یہ سہیلی
تنہا کوئی بن میرے مصیبت تھی ہی جھیلی — سمجھ لیجئے للہ شتابی یہ پہیلی

۱؎ مراد از چنگیز خاں ۱۲

۲؎ مراد از نادر شاہ ۱۲

۳؎ سلطان محمود غزنوی ۱۲

حائل ہوا جب الپسؔ تو رہ کس نے بنائی ہ
اُس کوہ کی کس نے تھی چڑھائی وہ چڑھائی

ہر حال میں ساتھ آپ کے دمساز رہی ہوں — ہر مشورتِ خاص میں ہمراز رہی ہوں
دکھلاتی ہر اِک کام میں اعجاز رہی ہوں — ہر معرکۂ جنگ میں جاں باز رہی ہوں

آپ اکثر اوقات میں ناکام پھری ہیں
میدانوں سے ہم ہی ظفر انجام پھری ہیں

بوالفضل کو میں نے کیا دستورِ معظم — اکبر کو ہر ایک شخص کی نظروں میں مکرم
مجھ سے ہی کھلا رایتِ غوریہ کا پرچم — وکٹوریہ کو بخشا بڑا حصہ عالم

شاہانِ زمانہ کو ہے آپس میں ملایا
سلطان کے اور زار کے جھگڑوں کو مٹایا

منچوریا کے قصے کو طے میں نے کیا ہ — اور مصر پہ دیکھو تو قدم میرا جما ہے
مشہورِ جہاں مجھ سے ہی بسمارکؔ ہوا ہے — افریقہ میں بوتھاؔ کو شرف میں نے دیا ہے

یورپ کی دول مجھ سے سرافراز ہوئی ہیں
سب قومیں غرض مجھ سے ہی ممتاز ہوئی ہیں

سلہ الپس اس دشوار اور برف پوش پہاڑ کا نام ہے جس پر سے فرانس کا مشہور عالی ہمت و بلند حوصلہ شہنشاہ نپولین بونا پارٹ بحسن تدبیر معہ سامانِ جنگ گذر سکا تھا۔

سلہ شیخ ابوالفضل مشہور مدبر با تدبیر شہنشاہ اکبر ۱۲

سلہ شہنشاہ جلال الدین اکبر بانی دین الٰہی ۱۲

سلہ جناب ملکہ معظمہ (مرحومہ) قیصرۂ ہند ۱۲

سلہ مراد از سلطان المعظم خلد اللہ ملکہم ۱۲

سلہ مراد زار روس ۱۲

سلہ پرنس بسمارک (آنجہانی) وزیر اعظم سلطنت جرمن ۱۲

سلہ جنرل بوتھا کمانڈر انچیف افواج ٹرانسوال ۱۲

انگلینڈ میں مجھ کو گلڈاسٹون[۱] سے پوچھو   بغداد میں جا کر ذرا ہارون سے پوچھو
منصور و دانیقی و مامون سے پوچھو   بقراط سے سقراط فلاطوں سے پوچھو

مہمان جو ترے ہیں وہ مرے زلّہ رُبا ہیں
حاکم جو ترے ہیں وہ مرے در کے گدا ہیں

دربار میں عزت ہے اگر کچھ تو مجھے ہے   سرکار میں وقعت ہے اگر کچھ تو مجھے ہے
آفاق میں شہرت ہے اگر کچھ تو مجھے ہے   دنیا میں لیاقت ہے اگر کچھ تو مجھے ہے

ہے کوئی اگر صاحب تمیز تو میں ہوں
در اصل ہے اکسیر کوئی چیز تو میں ہوں

چپ رہتی جو ہمّت تو بھلا تاب کہاں تھی   فرمایا کہ کیوں لاف سے آلودہ زباں کی
کیا اپنی صفت آپ ہی کرنی نہیں ہے خوبی   ہے بات وہی جس میں نکلے نہ کوئی فی

آ عقل سے پوچھیں کہ بھلا کون بڑی ہے
ڈھیلی ہے تو ہے کونسی اور کون کڑی ہے

بی عقل کہ پردہ سی یہ سب بحث تھیں سنتیں   آ سامنے کہنے لگیں دونوں گئی گذری ہیں
لازم تھی یہی بات کہ تم ایکے سے رہتیں   جب پھوٹ ہوئی دونوں میں کچھ کر نہیں سکتیں

تدبیر نہ شامل ہو تو ہمت ہے جہالت
ہمت کی نہ شرکت ہو تو تدبیر حماقت

سید علمدار حسین بنوڑی

۱؎ مسٹر گلیڈسٹون وزیر اعظم سلطنت انگلشیہ ضرورت شعری کے لحاظ سے گلڈاسٹون لکھا گیا

خار

تو سمجھتا ہے کہ اس باغ میں بیکار ہوں میں؛ محض بیکار ہی کیا موجب آزار ہوں میں؟
تو نے دیکھا ہے مجھے دیدۂ عبرت سے کبھی؟ قدر پوچھی ہے مری اہل بصیرت سے کبھی؟
ملک ہستی میں کوئی شے کہیں بے سود بھی ہے؟ جلوۂ حسن کسی چیز میں محدود بھی ہے؟
کلک قدرت نے لکھی ہے کوئی شے بے مطلب؟ اس[1] مسدس میں کوئی لفظ بھی ہے بے مطلب؟

نور خورشید کا ہر ذرہ میں ہے راز چھپا موج دریا کا ہے ہر قطرے میں انداز چھپا؟
ایک قانون کے تابع ہیں شجر ہو کہ حجر ایک سانچے میں ڈھلے ہیں کرۂ خاک و قمر
تو گل و خار میں کرتا ہے تمیزیں قائم دیکھ اُس آئین کو جس سے ہیں یہ چیزیں قائم
کس جگہ حسن کے آئین کا اظہار نہیں؟ گل ہی گل باغ جہاں میں ہے کہیں خار نہیں

آہ کیا چشم مشاہد کی ہے کوتہ نظری! جس سے دستور میرے حسن کی ہے جلوہ گری
دیکھئے حسنِ تناسب کا نمونہ ہوں میں! کیا دلاویز ہوں کیا شوخ نکیلا ہوں میں
ہے دل افروز میری نوک سناں کی سی چمک میری تشبیہ پہ اترائے حسینوں کی پلک
رنگ ہر شاخ پہ پاؤ گے نرالا میرا روپ ہر نخل پہ دیکھو گے انوکھا میرا
نگہِ حسن طلب دیکھے تو رعنا ہوں میں دل میں ہر رنگ میں ہر روپ میں کھبتا ہوں میں

رونق افروز ہے گل باغ میں زینت کے لئے میں چمن زار میں ہوں گل کی حفاظت کیلئے
دامنِ اہلِ تطاول میں اٹک جاتا ہوں دیدۂ حاسدِ گلچین میں کھٹک جاتا ہوں
نہیں آزار دہی خلق کی شیوا میرا پھر بھی گلچیں کی مدارات ہے عہدا میرا
توڑ لینا گل تر کا کوئی آسانی ہے؟ باغ میں یوں ہی نباہی کی ہوا آئی ہے
گل کو وہ اپنی غرض کے لئے برباد کرے کیوں نہ بندہ عملِ نشترِ فصاد کرے؟

---

[1] مراد از شش جہت ۱۲

راہ رو سے نہیں صحرا میں کبھی مجھ کو خلش — ہاں اگر بھائے اُسے آپ ہی غفلت کی روش
خود ہی مجھ خاک نشیں کو وہ کچل ڈالے مگر — تو کبھی اُس کو بتاتا ہوں سلامت کی ڈگر
سینکڑوں مور و ملخ وہ تو کچل دیتا ہے — یونہی چٹکی سی کبھی بندہ بھی لے لیتا ہے
اِس سے ہی نیند سے رہرو کو جگانا مقصود — قدر ہے خاک نشینوں کی بتانا مقصود
اِس سے کیا بڑھ کے کروں کام میں انسانوں کا؟ — میں نگہبان ہوں کھیتوں کا خیابانوں کا

یوں مری قدر کو جانے کہ نہ جانے کوئی
میرے احسان کو مانے کہ نہ مانے کوئی

میر نیرنگ

شمعِ ہستی

اے شمعِ ہستی اے زندگانی — بھاتی ہے دل کو تیری کہانی
ہے کوچ تیرا ہر لحظہ جاری — جاتی ہے بگٹٹ تیری سواری
بجلی سے بڑھ کر بیتاب ہے تو — یا واہمہ ہے یا خواب ہے تو
کیوں چپ چپاتی ہر دم رواں ہے — آئی کہاں سے جاتی کہاں ہے
ظاہر ہیں یوں تو سب پر ترے گُن — لیکن نہ پایا تیرا سرِ و بُن
گذرا نہ کوئی اس ہفت خواں سے — جاہل ہیں تیرے سرِّ نہاں سے
فی الجملہ ہمت سب ہار بیٹھے — ہیں سر بزانو ناچار بیٹھے

اے زندگانی اے شمعِ ہستی — سونی پڑی تھی تجھ بن یہ بستی
چاروں طرف تھی چھائی اندھیری — ناگاہ اُٹھی اک ڈبک تیری
وہ ڈبک تھی بس نورٌ علیٰ نور — کا ہے کو رہتی پردہ میں مستور
پھولوں میں جھلکی تاروں میں چمکی — بخشی جہاں کو رونق ارم کی
ہوتا نہ یاں جو تیرا ٹھکانا — چوپٹ ہی رہتا یہ کارخانہ
کیا پھونک ماری دنیا کی تن میں — گویا لگا دی دَوں خشک بن میں
بزمِ جہاں میں رونق ہے تجھ سے — اس میکدہ میں ہو حق ہے تجھ سے

ہے تیرے دم سے اے عالم آرا — بزمِ عروسی آفاق سارا
سرگرم ہے تو جادوگری میں — ہیں تیرے عشوے خشکی تری میں
مٹی کا جوبن تو نے نکھارا — دے دے کے چھینٹے اسکو اُبھارا

بے حس کو بخشا احساس تو نے — دی مشتِ گل کو بو باس تو نے
تھی بھولی بھالی بھونڈی بے ہنگم — تو نے سکھایا اس کو خم و چم
کر زنت سے تیرے سانچے میں ڈھل کر — کُندن سی نکلی رنگت بدل کر
ٹھکرا کے تو نے جب کہہ دیا قم — اُٹھ بیٹھی فوراً کرتی تبسم
بھولی ہے اپنی وفات پہلی — پھرتی ہے خوش خوش کیا اہلی گہلی

پاتی ہے خلقت جب تیری آہٹ — ہوتی ہے پیدا اک گدگداہٹ
بجتی ہے پھر تو او دہم غضب کی — بجتی ہے نوبت جنبش و طرب کی
کہتی ہے دنیا تو ہے تو کیا غم — تو آئے نت نت تو آئے جم جم
جیتے ہیں جبتک مرتے ہیں تجھ پر — سب کچھ تصدق کرتے ہیں تجھ پر
کیا مال ہے جو تیرے سوا ہے — تو ہی نہ ہو تو سب کو دیا ہے

لے سب کی پیاری سب کی چہیتی — کہ منہ زبانی کچھ آپ بیتی
"قدرت کے گھر کی ہیں لاڈلی ہوں — ناز و نعم سے برسوں پلی ہوں"
"تقویم احسن میرا لگن تھا — فردوس اعلےٰ میرا وطن تھا"
"حور و ملک کی آبادیاں تھیں — بیفکریاں تھیں آزادیاں تھیں"
"چلتی تھی ہر دم بادِ بہاری — شیر و عسل کی نہریں تھیں جاری"
"میری ادا پر مرتے تھے قدسی — سجدہ پہ سجدہ کرتے تھے قدسی"
"تکریم میری ہوتی تھی از حد — ہیں داستانیں جس کی زباں زد"
"پھر دیس چھوٹا گذری سو جھیلی — پردیسیوں کا اللہ بیلی"
"پل مارنے کا ہے یاں بسیرا — حبِ وطن ہے ایمان میرا"

"آب و ہوا میں دشت و جبل میں — میری رسائی ہے ہر محل میں"

"لیکن یہاں میں خلوت نشین ہوں — ہوں اس طرح پر گویا نہیں ہوں"
"خواب گراں کی حالت ہے طاری — مستی میں گم ہے سب ہوشیاری"
"جب آتے آتے سبزہ میں آئی — کروٹ بدل کر میں لہلہائی"
" انگڑائیاں لیں منہ کھول ڈالا — پر آنکھ سے کچھ دیکھا نہ بھالا"
" داخل ہوئی جب حیوان کے تن میں — اک شور اُٹھا اس انجمن میں "
" انسان کا جامہ جب میں نے پہنا — اللہ رے میں کیا میرا کہنا"
"کس کس جتن سے میں نے بنایا — رتبہ بہ رتبہ پایا بسایا"
جامد کو نامی کو حیوان — حیواں کو وحشی وحشی کو انسان
پھیلایا میں نے کیا کیا بکھیڑا — شادی و غم کے ارگن کو چھیڑا
نیکی بدی کے میلے جمائے — جھوٹ اور سچ کے سکے چلائے
جو ناچ میں نے جس کو نچایا — وہ ناچتے ہی اُس کو بن آیا
القصہ ہوں میں وہ اسم اعظم — ہے جس کے بس میں تسخیر عالم
کچھ کچھ کھلے ہیں انداز میرے — دیکھے ہیں کس نے اعجاز میرے
مجھ کو نہ سمجھو تم آج کل کی — ہوں موج مضطر بحر ازل کی
رکھوں گی جاری یونہی سفر میں — قعر ابد کی لوں گی خبر میں
ہے ہستی میری اک طرفہ معجون — کچھ بھی نہیں ہوں پر میں ہی میں ہوں

سنتے رہو گے میری کہانی
جب تک ہے باقی دنیائے فانی

مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی

جوئے آب

غیرتِ باغِ ارم ایک نظارا تیرا
رشکِ فردوس بریں ایک تماشا تیرا
ہائے وہ شام و سحرگاہ کا جلوہ تیرا
دلِ مشتاق ہوا جاتا ہے شیدا تیرا

دردمندوں کے لئے باعثِ آرام ہے تو
نام سے جس کے ہو راحت وہ دلارام ہے تو

واہ کیا شان ہے کیا رعب ہے کیا ہے شوکت
واہ کیا زور ہے کیا شور ہے کیا ہے قوت
آہ بہنا یہ ترا آہ تری یہ وسعت
اُف تری شوخ ادائیں تری پیاری صورت

چاندنی چاندنی سب کہتے ہیں ہم جانتے ہیں
کوئی ہو تجھ سے مقابل کہیں ہم مانتے ہیں

ٹھنڈی ٹھنڈی تجھے چھو کر جو ہوا آتی ہے
غنچۂ خاطرِ ناکام کھلا جاتی ہے
نور کی تیری جھلک چاند کو شرماتی ہے
تیری یہ طرزِ خرام آہ غضب ڈھاتی ہے

چھیڑنا ساحلِ شیدا کا تجھے بھاتا ہے
واہ شاباش ہے کیا ناز کا ڈھب آتا ہے

چاندنی رات میں دیکھے کوئی تیرا جوبن
ہائے وہ روپ کہ قربان ہو صحنِ گلشن
وہ سما نور کا اور بادِ صبا کا وہ چلن
وہ سکوں چار طرف چھایا فدا جس پہ سخن

تنِ نازک کا وہ نقشہ کہ خجل آئینہ
شرم سے آب ہو بلّور غضب وہ سینہ

دن کو وہ کھیلنے سورج کی کرن کا آنا
ناز و انداز کا رنگین وہ تانا بانا
آہ وہ جوش میں چلتے ہوئے تیرا گانا
باتوں باتوں میں اک عالم کو لبھا لیجانا

چھیڑنا بادِ صبا کا وہ تجھے مستی سے

ہائے وہ چین بجبیں ہونا ترا شوخی سے
دامنِ کوہ سے اٹھلا کے نکلنے والی
ساحتِ دشت میں انداز سے چلنے والی
رنگ ایک آن میں لاکھوں ہی بدلنے والی
سبزۂ گل کے قریب آکے مچلنے والی
تو ہی تزئین ہے کھیتوں کی بیابانوں کی
تو ہی تفریح ہے حیوانوں کی انسانوں کی
آہ اے نشۂ بیخود کنِ پیمانۂ حسن
آہ اے کیفیتِ بادۂ جانانۂ حسن
ہائے کیا بات تری شورشِ میخانۂ حسن
واہ شاباش تجھے او دلِ دیوانۂ حسن
تو سلامت رہے دنیا میں الٰہی دائم
زندگی اپنی ہے تیرے ہی تو دم سے قائم

سید نذیر حسین

تسکینِ قلب

میرے چاہنے والے کیوں رو رہے ہیں — یہ جان اپنی کس واسطے کھو رہے ہیں؟
میں مُردہ نہیں ہوں ٹھکانا نیا ہے جی ہے — کہوں کیا مرے دِل کو کیسی خوشی ہے
نہ روئیں۔ نہ روئیں۔ ابھی خشک ہونگے — جو قطرے ہیں رخسار پر آنسوؤں کے
میرا حال سُن کر اُنہیں غم نہ ہوگا — وہ رنج و تعب اور وہ ماتم نہ ہوگا
بر آئی ہے مرنے پہ میری تمنّا — وہاں پہنچا ملنے کا وعدہ جہاں تھا
خدا نے نصیبوں سے یہ دن دکھائے — ثمر خشک شاخوں میں اب جاکے آئے
یہاں تاج تاروں کا ہے میرے سر پر — کہاں جاکے چمکا ہے میرا مقدر
ٹہلتا ہوں ہر وقت خلدِ بریں میں — محبّت کا معدن ہے جس سرزمیں میں

میرے چاہنے والے ہرگز نہ روئیں
غمِ ہجر میں جان اپنی نہ کھوئیں
مرے واسطے رنج اُٹھانے سے حاصل!
یہ رونے سے آنسو بہانے سے حاصل

وہاں میرے رہنے کی تھی کون صورت؟ — جہاں تھی مروت۔ محبّت نہ الفت
گناہوں کا اور موت کا تھا جو مسکن — جہاں ایک صورت میں تھے دوست دشمن!
جہاں ابرِ غم تھا۔ اندھیرا بہت تھا — جہاں جان جانے کا کھٹکا بہت تھا
یہاں کی مگر زندگی۔ زندگی ہے — سراپا مسرّت مجسّم خوشی ہے
یہاں ناز کرتے ہیں مجھ پر فرشتے — اُٹھے ہر طرف سے اُن آنکھوں کے پردے
مکاں ہے میرا جلوہ گاہِ محبّت — میسّر ہے ہر دم کسی کی زیارت

یہ اس مصحفِ رُخ میں لکھا ہوا ہے   خوشی میں بقا ہے تو بعدِ فنا ہے
جو پہنچا جہاں تک یہ اُس کی عنایت   خوشا میری قسمت، خوشا میری قسمت

مرے چاہنے والے ہرگز نہ روئیں
غمِ ہجر میں جان اپنی نہ کھوئیں
مرے واسطے رنج اُٹھانے سے حاصل؟
یہ رونے سے آنسو بہانے سے حاصل

سید علی سجاد

پدمنی

عندلیبوں کو ملی آہ و بُکا کی تعلیم　　اور پروانوں کو دی سوزِ وفا کی تعلیم
جب ہر اک چیز کو قدرت نے عطا کی تعلیم　　آئی حصّے میں ترے ذوقِ فنا کی تعلیم
نرم و نازک تجھے اعضا دیئے جلنے کے لئے
دل دیا آگ کے شعلوں پہ پگھلنے کے لئے

رنگ تصویر کے پردہ میں جو چمکا تیرا　　خود بخود لوٹ گیا جلوۂ رعنا تیرا
ڈھال کر کالبدِ نور میں پُتلا تیرا　　یدِ قدرت نے بنایا جو سراپا تیرا
بھر دیا کوٹ کے سوزِ غمِ شوہر دل میں
رکھ دیا چیر کے اک شعلۂ مضطر دل میں

تو وہ تھی شمع کہ پروانہ بنایا تجھ کو　　تو وہ لیلیٰ تھی کہ دیوانہ بنایا تجھ کو
رونقِ خلوتِ شاہانہ بنایا تجھ کو　　نازشِ ہمتِ مردانہ بنایا تجھ کو
ناز آیا ترے حصّے میں۔ ادا بھی آئی
جاں فروشی بھی۔ محبّت بھی۔ وفا بھی آئی

آئی دنیا میں جو تو حسن میں یکتا بنکر　　چمنِ دہر میں پھولی گُلِ رعنا بن کر
رہی ماں باپ کی آنکھوں کا جو تارا بنکر　　دلِ شوہر میں رہی خالِ سویدا بن کر
حسنِ خدمت سے شگفتہ دلِ شوہر رکھا
کہ قدم جادۂ طاعت سے نہ باہر رکھا

تیری فطرت میں مروّت بھی تھی غمخواری بھی　　تیری صورت میں ادا بھی تھی طرحداری بھی
جلوۂ حسن میں شامل تھی نکوکاری بھی　　درد آیا ترے حصّے میں تو خودداری بھی
آگ پر بھی نہ تجھے آہ! مچلتے دیکھا

تپش حسن کو پہلو نہ بدلتے دیکھا

حسن سیرت سے تھی تیری منجلا تصویر
تو وہ عصمت کی تھی او! آئینہ سیما تصویر

تجھکو قدرت نے بنایا تھا سراپا تصویر
لاکھ تصویروں سے تھی اک تری زیبا تصویر

نور ہی نور تیرے جلوۂ مستور میں تھا

انجم ناز کا جھرمٹ رخ پُر نور میں تھا

کہ قیامت کی ادا تیرے ہر انداز میں تھی
لب میں اعجاز، حیا چشم فسوں ساز میں تھی

برق بیتاب تری جلوہ گہ ناز میں تھی
شکل پھرتی جو تیری دیدۂ غماز میں تھی

یہ وہ بجلی تھی قیامت کی تڑپ تھی جس میں

شعلۂ ناز عقوبت کی تڑپ تھی جس میں

کوندا اٹھی قلعۂ چتوڑ میں جولاں ہوکر
یہ وہ بجلی تھی جو تیغ شرر افشاں ہوکر

خاک سے لوٹ گئی تیری پشیماں ہوکر
یہ وہ بجلی تھی جو سوز غم جہاں ہوکر

یہ وہ بجلی تھی تجھے جس کے اثر نے پھونکا

رفتہ رفتہ تپش سوز جگر نے پھونکا

آہ! او ہند کے ناموس وفا کی دیوی
آہ! او عشوہ و انداز و ادا کی دیوی

او زیارت کدۂ شرم و حیا کی دیوی
آہ! او پیکر تو انوار صفا کی دیوی

تیری تقدیس کا قائل ہے زمانہ اب تک

تیری عفت کا زباں پر ہے فسانہ اب تک

آفریں ہے تری عفت، تری عصمت کیلئے
آفریں ہے تری جان ناز کی ہمت کیلئے

کہ چلی آتی ہے اک خلق زیارت کے لئے
کیا مثا سکتا زمانہ تری شہرت کے لئے

نقش اب تک تری عظمت کا ہے بیٹھا دل میں

تو وہ دیوی ہے ترا لگتا ہے میلا دل میں

سرور جہان آبادی

حسن اور زوال

اصل خیال جرمن نثر میں دیکھا گیا ہے۔ میں نے ناظرین مخزن کے لئے تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ اُردو نظم میں منتقل کر دیا۔ (اقبال)

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا
جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا؟
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا
شب دراز عدم کا فسانہ ہے دنیا
ہوئی ہے رنگ تغیر سے جب نمود اسکی
وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی
کہیں قریب تھا یہ گفتگو قمر نے سنی
فلک پہ عام ہوئی اختر سحر نے سُنی
سحر نے تارے سے سُن کر سنائی شبنم کو
فلک کی بات بتا دی زمین کے محرم کو
بھر آئے پھول کے آنسو پیام شبنم سے
کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے
چمن سے روتا ہوا موسم بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

اقبال

مرغ و صیاد

اے نسیمِ صبح اے گہوارۂ جنبانِ چمن
ہو اگر تیرا گذر سوئے جوانانِ چمن

اُن سے کہنا میری جانب سے بصد اظہارِ شوق
ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں جو یارانِ چمن

اِک گرفتارِ قفس نے ہے کہا تم کو سلام
اور پوچھا ہے مزاجِ سرو قدِ سبحانِ چمن

پھر یہ دینا میری جانب سے نویدِ جاں فزا
سیرِ گلشن ہو مبارک تم کو مرغانِ چمن

خاک اُڑا کر پہلے چپ ہو جائیو بادِ صبا
حال پوچھیں کچھ جو میرا ہمصفیرانِ چمن

پھر یہ کہنا کھینچ کر سینے سے آہِ جانگداز
ہے قفس میں قید وہ مرغِ خوش الحانِ چمن

اب نہ سیرِ لالہ و گل ہے نہ وہ گلگشتِ باغ
حسرتِ پرواز ہے اب اور ارمانِ چمن

اب نہ وہ پھولوں کا تختہ ہے نہ کُنجِ خوشگوار
وہ نہالانِ چمن ہیں اب نہ میدانِ چمن

تنکے چنتا ہے پڑا کُنجِ قفس میں اب غریب
آشیاں کیسا! کہاں کی فکرِ سامانِ چمن

توڑتا ہے خانۂ صیاد میں دم ہائے ہائے
ہو رہا ہے بسملِ تصویرِ ماتم ہائے ہائے

چھیڑتی ہے کیا قفس میں آ کے ہلکولے موجِ نسیم
اس چمن میں ہم بھی تھے پروردۂ نازِ قدیم

تھی ہماری بھی کبھی سرسبز کشتِ آرزو
ہم پہ بھی اے ابرِ رحمت تھا ترا لطفِ عمیم

لوٹتے تھے آہ دن کو سبزہ زاروں کے مزے
شب کو رہتے تھے تر و شاداب کنجوں میں مقیم

یا چہکتے پھرتے تھے باغوں میں ہم اے ہمصفیر
یا قفس میں چیختے ہیں آہ بے یار و ندیم

ہم کہاں کے خوشنوا تھے ہم کہاں کی بذلہ سنج
ہم پہ اے صیاد ٹوٹا جو ترا قہرِ عظیم

ہمصفیرانِ چمن کے کیا تغافل کا گلہ
جب قفس میں پھنس گئے کیسی رہ و رسمِ قدیم

ذبح کر لے صیاد کر بھی چک کہ جھگڑا پاک ہو
ہم سے اب دیکھا نہیں جاتا ہے یہ حالِ سقیم

پھونک دے اے سوزِ غم ہائے نہانی پھونک دے
بن کے او ظالم بھڑک اُٹھ اے شعلۂ نارِ جحیم

ہم ہیں پابندِ قفس کیسا چمن کیسی بہار   کس کو مژدہ دینے آئی ہے تو اے بادِ نسیم

دیدِ گل سے واسطہ کیا ہم اسیروں کے لئے
سیرِ گلشن ہو مبارک ہمصفیروں کے لئے

لالہ و گل کی تھی قسمت میں فضا دو چار دن   ہمنے کھالی سبزہ زار و نکی ہوا دو چار دن
پھر سنیگا ہائے کس کے زمزمے صیّاد تو   ہم قفس میں اور ہیں نغمہ سرا دو چار دن
حسرتِ پرواز بھی جاتی رہی گی اے اجل!   ہم سے اڑ لیں اور مرغانِ ہوا دو چار دن
پھر کہاں صیّاد ہم اور پھر کہاں کنجِ قفس   آب و دانہ ہے مقدر میں ترا دو چار دن
گھُٹ کے اس زندان میں جائیگا کبھی تو دم نکل   مانگتے ہیں اے اجل! تیری دعا دو چار دن
یاد اے صیّاد! ہم کو بھی کرے گا تو کبھی   اور تڑپا لے قفس میں بیوفا دو چار دن
دیکھ کر خالی قفس کو جی بھر آئے گا ترا   بیٹھ کر روئے گا سر بعدِ فنا دو چار دن
کر رہے ہیں جسطرح ہم نالہائے دردناک   تو رہیگا یونہی مصروفِ بکا دو چار دن
یاد جب صیّاد آئیں گے ہمارے زمزمے   گھر میں تنہا تیرا جی گھبرائیگا دو چار دن

دستِ حسرت مل کے اے صیّاد پچھتائے گا تو
ایسا لائے گا کہاں سے آہ مرغِ خوش گلو

جب بنائیگا ہمارا آہ! چھوٹا سا مزار   چپکے چپکے تو ہمارے غم میں ہوگا اشکبار
یاد رہ رہ کر جفائیں اپنی آئیں گی تجھے   اور ہماری بیکسی پر روئے گا تو زار زار
لیکے خالی گھر کو جب گلشن سے لوٹیگا قفس   پیچھے پیچھے خاک اڑاتی آئے گی بادِ بہار
سُنکے اے صیّاد! تیرے نالہائے جانگداز   راستے میں لوگ پوچھینگے کہ کیوں ہے سوگوار
تو کہے گا مر گئی وہ بلبلِ رنگیں نوا   وصلِ گل کیواسطے تھی جو قفس میں بیقرار
گُل کھلیں گے۔ سبزۂ نورس اُگیگا قبر پر   ہم نہ ہونگے اور آئے گی گلستاں میں بہار
سوتے ہونگے تیرے گہوارے میں اے کنجِ لحد   خوابِ راحت میں مخل ہو گی نہ گلبانگِ ہزار
اپنی مٹی ہے کہاں کی کیا خبر۔ بادِ صبا!   ہو پریشاں دیکھئے کس کس جگہ مشتِ غبار
وہ بھی آزادی کے دن تھے ہائے کتنے جانفزا!   تیری بندھن سے تھے جب اے قیدِ ہستی رستگار

لوٹتے تھے اپنے گلشن میں بہاروں کے مزے
سبزہ زاروں کی تھیں سیریں۔ جوئباروں کے مزے

ہم سرودِ طائرانِ قدس تھے ہم بھی صبا!
قیدِ ہستی کی کشاکش میں نہ تھے یوں مبتلا

بولتے تھے ہم وطن میں پیاری پیاری بولیاں
ہائے وہ دن! شاخِ طوبیٰ پہ تھے جب نغمہ سرا

لوٹتے تھے ہم بہاریں گلشنِ فردوس کی
تھی عجب دلکش ہمارے سبزہ زاروں کی فضا

کھل رہے تھے چارسو پھولوں کے کنج خوشنما
تھیں رواں شیر و عسل کی ان میں نہریں جابجا

اپنے پھولوں پر تو اتراتی ہے کیا اے عندلیب!
تو نے دیکھی ہی نہیں ہے شاہدِ گل کی ادا

کر کے ہم کو تو اسیرِ حلقۂ دامِ فریب
کھینچ کر کس وادیٔ پر خار میں لائی قضا

ہم نہ پھنستے کس طرح صیاد تیرے جال میں
آب و دانہ تھا مقدر میں ترے گھر کا لکھا

ہم قفس میں کب تلک بے بال و پر تڑپا کریں
ٹوٹ بھی جا اے طلسمِ قیدِ ہستی۔ ٹوٹ جا

تیرے مرغِ دست پرور ہم ہیں صیادِ ازل!
خواہ ہم کو ذبح کر تو۔ خواہ ہم کو کر رہا

من نہ آں مرغم کہ نالم از جفائے تیغ تو
ذبح کن صیاد۔ قربان ادائے تیغ تو

سرور جہان آبادی

ایک پرندے کی فریاد ۱؎

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ
وہ جھاڑیاں چمن کی وہ میرا آشیانہ

وہ ساتھ سب کے اُڑنا وہ سیر آسماں کی
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا مل کے گانا

پتّوں کا ٹہنیوں پر وہ جھومنا خوشی سے
ٹھنڈی ہوا کے پیچھے وہ تالیاں بجانا

آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی
اپنی خوشی سے جانا اپنی خوشی سے آنا

لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم
شبنم کا صبح آکر پھولوں کا مُنہ دُھلانا

وہ پیاری پیاری صورت وہ کامنی سی مورت
آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانہ

تڑپا رہی ہے مجھ کو رہ رہ کے یاد اُس کی
تقدیر میں لکھا تھا پنجرے کا آب و دانہ

اس قید کا الٰہی دکھڑا کسے سناؤں
ڈر ہے یہیں قفس میں میں غم سے مر نہ جاؤں

کیا بدنصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں
ساتھی تو ہیں وطن میں میں قید میں پڑا ہوں

آئی بہار کلیاں پھولوں کی ہنس رہی ہیں
میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں

باغوں میں بسنے والے خوشیاں منا رہے ہیں
میں دُکھیلا اکیلا دُکھ میں کراہتا ہوں

آتی نہیں صدائیں اُن کی مرے قفس میں
ہوتی مری رہائی اے کاش میرے بس میں

ارمان ہے یہ جی میں اُڑ کر چمن کو جاؤں
ٹہنی پہ گل کی بیٹھوں آزاد ہو کے گاؤں

بیری کی شاخ پر ہو ویسا ہی پھر بسیرا
اس اُجڑے گھونسلے کو پھر جا کے میں بساؤں

چگتا پھروں چمن میں دانے ذرا ذرا سے
ساتھی جو ہیں بچھڑے اُن سے ملوں ملاؤں

پھر دن پھریں ہمارے پھر سیر ہو وطن کی

۱؎ بہ اجازت ٹکسٹ بک کمیٹی پنجاب۔

اڑتے پھریں خوشی سے کھائیں ہوا چمن کی

جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے
دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے

گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے
دُکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے

آزاد جس نے رہ کر دن اپنے ہوں گذارے
اُس کو بھلا خبر کیا یہ قید کیا بلا ہے

آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے
میں بے زبان ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

اقبال

بادکش کی تقریر

از منشی رام سہائے صاحب تمنا لکھنوی۔ ڈپٹی انسپکٹر مدارس اُناؤ

جو ہیں اربابِ غرض اُنکا نہیں پنہاں ہے حال — اپنے مطلب کے لئے لیتے ہیں تدبیریں نکال
یہ غرض وہ ہے کہ جسکو الغرض ہے اپنی فکر — سب کے آگے ہے یہ پھیلائے ہوئے دستِ سوال
جتنی ایجادیں ہوئی ہیں ہے ضرورت اُنکی ماں — جس سے ہو پوری غرض طالب وہی چلتے ہیں چال
فصلِ گرمی کی جو سرگرمی سے آئی خلق میں — ہو گیا بیچین ہر پیر و جوان و خورد سال
بارشِ آتش ہوئی وہ چشمۂ خورشید سے — دھوپ میں باہر نکلنا ہو گیا امرِ محال
الاماں گرمی کی شدت اُف رے حدت فصل کی — ہر مسامِ مُو سے نکلا ہے پسینے کا ادبال
تنگ ہے حبسِ ہوا سے روح کا بھی قافیہ — ہر مکاں میں ہر مکیں ہے بیقرار و پُر ملال
دیکھ کر یہ حال نازک لوگ گھبرائے بہت — دور ہو کس طرح گرمی کی یہ باہم قیل و قال
پہلے کوشش کی کہ ہو بادِ صبا اُن کی کنیز — لیکن اسکے آگے اُنکی گل سکی ہرگز نہ دال
جب ہوا آئی نہ قبضے میں تو سوچا اور ڈھنگ — آیا دل میں بادکش تیار کرنے کا خیال
توڑ کر اک تاڑ کو توڑیں کچھ اُس کی پتیاں — اُن کو یکجا کر کے جمعیت کا دکھلایا جمال
دستکاری بھی دکھائی۔ کام بھی اپنا کیا — ہاتھ میں لیکر گھمایا۔ مجھ کو دنیا کی مثال
جب میں گھوما خود ہوا آکر لگے پیدا ہو گئی — ہو گئی غائب اُمس دل ہو گئے سب کے نہال
جب تلک میں دوسری صورت میں تھا بالائے شاخ — کوئی بھی میری طرف مطلق نہ کرتا تھا خیال
جب سے پنکھا بن گیا بکنے لگا بازار میں — مجھ کو ہاتھوں ہاتھ اب لینے لگے نازک خیال
اب جسے گرمی لگی اُس کو ہوئی میری تلاش — میری فرقت عاشق و معشوق کو بھی ہے وبال
بزمِ سلطاں میں بھی میں پہنچا بفضلِ کبریا — دیکھو برگِ خشک نے دکھلایا کیا رنگِ جلال
دیکھئے تبدیلِ صورت بھی عجب اِک چیز ہے — بدر پیدا ہوا اسی سے اور اسی سے ہو ہلال

سچ جو پوچھو قدر کے قابل ہے یہ قولِ خرد
ہر کمالے را زوال و ہر زوالے را کمال

خشک پتوں سے نہ گر پنکھا بناتے مجھکو لوگ
آج کیونکر اس قدر حاصل مجھے ہوتا کمال

اپنی بیقدری سے افسردہ نہ ہو انساں کبھی
وقت جب آتا ہے اچھا دور ہوتا ہے ملال

جو کرے کوشش کسی کی بہتری کیواسطے
اس پہ رہتا ہے ہمیشہ فضلِ ربِّ ذوالجلال

بادکش کے قبضے میں جسطرح رہتی ہے ہوا
اہلِ محنت کے بھی قبضے میں ہے جاہ و ملک و مال

اے تمنّا ہے بیانِ بادکش بند نفیس
ہو گیا شاداب و تر اس کی ہوا سے باغِ قال

تمنّا لکھنوی

بُلبُل شیدا

یہ نظم جو ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ منشی احمد حسین خانصاحب بی۔ اے کی طبع رسا کا نتیجہ ہے۔ خاں صاحب موصوف لاہور کی عدالت سشن میں عہدۂ مترجم کی خدمات انجام دینے کے علاوہ تصنیف و تالیف میں ایک مشق خاص رکھتے ہیں۔ ناول انہوں نے لکھے ہیں۔ ناٹک انہوں نے تیار کئے ہیں۔ نظمیں ہر قسم کی ان کے کلام میں موجود ہیں۔ ان کی کوششوں سے ایک مشاعرہ انحاد لاہور میں کچھ عرصے سے قائم ہے جس میں ہندو مسلمان برابر شریک ہو کر طبع آزمائیاں کرتے ہیں۔ خانصاحب اس مشاعرے کے سکریٹری ہیں چنانچہ حال میں جو ایک بڑی رونق کا مشاعرہ ۲۵۔ مئی ۱۹۰۶ء کو ہوا۔ اُس میں اُنہوں نے "بلبل شیدا" کے ساتھ اس طرح اظہار ہمدردی کیا۔

اے عندلیب باغ میں گلچیں ہزار ہو　　پونچھ آنسوؤں کو تیری بلا بے قرار ہو
آہ۔ صبر تیری گردن نازک میں ہار ہو　　اور موسم بہار بھی تجھ پہ نثار ہو
ہاں فصل گل میں گل سے جو تجھ کو جدا کرے
"وہ بھی مراد اپنی نہ پائے خدا کرے"

آ۔ عندلیب نغمۂ مرجہنگ فال ہو　　آ خال بن کے زیور رخسار حال ہو
آ رنگ بن کے رونق چشم غزال ہو　　آ میرے دل میں طائر باغ خیال ہو
عنوان ہیں خراب ترے اضطراب کے
آ دوں ہیں تیرے چہرے پہ چھینٹے گلاب کے

میں تیرے اضطراب سے سیماب بن گیا　　نالوں سے تیرے ماہئے بے آب بن گیا

ہر اشکِ شکِ قطرۂ تیزاب بن گیا　　کانٹوں کا فرش بسترِ کمخواب بن گیا
تو عندلیب روح کسی مبتلا کی ہے
"آواز ہائے یہ کسی دردآشنا کی ہے"

آ میرے پاس دیکھ میری جاں نثاریاں　　دیکھی ہوئی ہیں پھولوں کی غفلت شعاریاں
مشہور ہیں جہاں میں مری غمگساریاں　　آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
آ دونوں کے سر سے اُٹھائیں الم کی سِل
"تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل"

لیکن فغاں سے ہم دلِ مقصد نہ پائیں گے　　کیا فائدہ جو فتنۂ محشر جگائیں گے
پھولوں کو حالِ زار پہ اپنے ہنسائینگے　　پروانے بزمِ شمع میں ہم کو اڑائیں گے
ہو ضبط سے اثر پہ جہاں کو خبر نہ ہو
یوں مانگئے دُعا کہ زباں کو خبر نہ ہو

کیوں غم کی تیز آگ میں ہر دم جلا کریں　　کیوں ہم قتیلِ خنجرِ حسرت رہا کریں
اے عندلیب کس لئے شور و بکا کریں　　آ دونوں مل کے شام و سحر یہ دعا کریں
دُل دے تو اس مزاج کا پروردگار دے
"جو رنج کی گھڑی بھی خوشی سے گذار دے"

آ چل وہاں چلیں کہ جہاں پاسباں نہ ہو　　لیلی ہو اور قیس ہو پر ساربان نہ ہو
ہاں ہوں تو تیرے پھول ہوں پر باغباں نہ ہو　　واں میں ہوں وہ ہوں اور کوئی درمیاں نہ ہو
ہر روز غیر دل کو ہمارے ہیں توڑتے
کیا ہو گیا ہمیں کہ نہیں اُن کو چھوڑتے

اک اپنے غم سے پڑ گئیں چہرے پہ چھائیاں　　اک تیرے غم میں اُڑتی ہیں رُخ پر ہوائیاں
کس مُنہ سے میں بیان کروں بیوفائیاں　　ان سب کی کج ادائیاں بے اعتنائیاں
جب لاتے ہیں چنگیر میں پھولوں کو ڈال کے
لے جاتے ہیں ہمارا کلیجہ نکال کے

کس دل سے یہ سنبھالتے ہاتھوں میں تیر ہیں ۔ کس دل سے ہم کو کرتے قفس میں اسیر ہیں
ہاں سچ ہے ہم بیچارے نہایت حقیر ہیں ۔ پر اپنے گھر میں خوش ہیں اگر ہم فقیر ہیں
ہم بیکسوں کو کس لئے ناحق ہیں چھیڑتے
حیرت ہے مجھ کو کیوں نہیں اپنی نبیڑتے

صیاد بن کے دامِ بلا میں اُچھالنا ۔ اور بیکسی میں محفلِ گُل سے نکالنا
ہاں قینچ کر کے پر ہمیں پنجرو میں ڈالنا ۔ کیا اس کو ہی جہان میں کہتے ہیں پالنا
اے ظالمو بنا نے ہو ناحق بہانہ کیا
تم کو کہے گی خلقِ خدا غائبانہ کیا

اے گل نہ تو مہک کہ مہکنا گناہ ہے ۔ اے غنچے مت چٹک کہ چٹکنا گناہ ہے
ہاں سبزۂ چمن یہ مہکنا گناہ ہے ۔ اے عندلیب آج چہکنا گناہ ہے
صادق ہمارے واسطے اب یہ مثل ہوئی
"اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شدی"

اللہ کی شان میرا گریبان پھاڑ کے ۔ اور مثلِ خاک دامنِ عزت سے جھاڑ کے
رونے پہ میرے ہنستے ہیں مجھ کو بگاڑ کے ۔ خوش ہوتے ہیں یہ پھولوں کا تختہ اُجاڑ کے
کیا دل ہیں اپنے سمجھے ہیں یہ؟ ان کو خبر ہے
تجھ سے تو تھا یہ مجھ سے بھی دیکھو ان کو بیر ہے

جب میں مروں تو دل سے نہ مجھ کو بھلائیو ۔ ہاں گاہے گاہے قبر پہ احمدؔ کی آئیو
اس بیوفا جہان کے پیچھے نہ جائیو ۔ اور اپنا قصہ بلبلِ شیدا سنائیو
میں گرچہ تیرے باغ کے پھولوں میں خار تھا
پر زندگی میں تیرے لئے بے قرار تھا

احمد حسین

شاہ اور ہم

(یعنی)

سرورِ قناعت

اگر شاہ مُلکِ ارم کا مکیں ہے بھرے گھر میں رنجش سے خالی نہیں ہے
ہماری طرح وہ بھی اندوہگیں ہے اُسے فکرِ دُنیا ہمیں فکرِ دیں ہے
وہ اپنے الم میں ہم اپنے الم میں
رہا فرق کیا شاہ میں اور ہم میں

بظاہر سرِ شاہ پر تاجِ زر ہے مگر باطناً روز و شب خوف سر ہے
وہاں قلبِ مجروح۔ زخمی جگر ہے یہاں تیغ کا ڈر نہ فکرِ سپر ہے
ہم آرام میں شاہ رنج و سقم میں
یہی فرق ہے شاہ میں اور ہم میں

وہاں خوانِ نعمت مگر اشتہا کم یہاں اشتہا پر سوالِ غذا کم
نہیں ہم کو اصلاً خیالِ سوا کم قناعت ہمارا خزانہ ہے کیا کم؟
ہم آسودہ دل۔ شاہ حرصِ نعم میں
یہی فرق ہے شاہ میں اور ہم میں

وہاں چاپلوسی۔ تملّق۔ خوشامد خوشامد بر آمد سے بنا سر آمد
دو رنگی دل دوستاں کی شدآمد وفا کی جدا مد جفا کی جدا مد
نہ خوش مدح میں ہم۔ نہ مغموم ذم میں

یہی فرق ہے شاہ ہیں اور ہم ہیں

اگر شاہ کے ہاتھ میں جامِ جم ہے یہاں اُدک اپنا جو ہے، کس سے کم ہے!
اگر شاہ مل جائے ناز و نعم ہے دل اپنا غنی ہے، غنیمت بہ دم ہے

جو ہم میں ہے وہ شاہِ والا حشم میں
رہا فرق کیا شاہ میں اور ہم میں

وہ بدخواب ہیں، نوم شب کھو رہے ہیں مگر پاؤں پھیلائے ہم سو رہے ہیں
وہاں دیدۂ شاہ خوں رو رہے ہیں یہاں اپنے آنسو گہر ہو رہے ہیں

ہم آزادِ غم سے وہ پابندِ غم میں
یہی فرق ہے شاہ میں اور ہم میں!

کوئی شاہ بادل بُلا دے تو جانیں کوئی برق و باراں گرا دے تو جانیں
کوئی حرفِ قسمت پڑھا دے تو جانیں مقدّر کا لکھا مٹا دے تو جانیں

نہ ہم میں یہ قدرت نہ اُس ذی حشم میں
رہا فرق کیا شاہ میں اور ہم میں

وہاں جو فروش اور گندم نما ہیں جو اعیانِ دولت ہیں زر آشنا ہیں
یہاں جتنے دم ساز ہیں بے ریا ہیں نہ اہلِ غرض ہیں نہ اہلِ دغا ہیں

ہم اہلِ کرم ہیں وہ اہلِ ستم ہیں
یہی فرق ہے شاہ میں اور ہم میں

وہاں غلبۂ حرصِ کشور کشائی یہاں ملکِ تسلیم کی بادشاہی
وہاں فرشِ سندس بساطِ غنائی یہاں بوریا مسندِ بے ریائی

ہم آزاد وہ بستۂ فکرِ دام و درم ہیں
یہی فرق ہے شاہ میں اور ہم میں

وہاں جاوداں رشکِ جاہ و نعم ہے حضوری میں ہے مدح، غیبت میں ذم ہے
یہاں ایک ساں حالتِ بیش و کم ہے نہ آنے کی شادی نہ جانے کا غم ہے

کھلے بند ہم۔ شاہ قیدِ حرم میں
یہی فرق ہے شاہ میں اور ہم میں

وفورِ دول میں مسرّت نہیں ہے
وہ مسرور ہے جو قناعت گزیں ہے
جسے فرش سنجاب سطحِ زمین ہے
اُسی کا دلِ پاک عرشِ بریں ہے
ہم اور شاہ یکساں ہوئے جب شکم میں
رہا فرق کیا شاہ میں اور ہم میں؟

یہاں زینتِ نیک نامی ہوا ہے
یہاں عرشِ دل سدرۃ المنتہا ہے
یہاں قلب قانع مسرت فزا ہے
جگر دولتِ عافیت سے بھرا ہے
ہم آلام داخل سمجھتے ہیں سم میں
یہی فرق ہے شاہ میں اور ہم میں

ہمیں گنجِ عرفان وادراک بس ہے
کہ اللہ بس اور باقی ہوس ہے
ہوا و ہوس سے حذر ہر نفس ہے
نہ ذوقِ جہاں ہے نہ شوقِ قفس ہے
ہمارے قدم ہیں تلاشِ قدم میں
یہی فرق ہے شاہ میں اور ہم میں

ثمر ہم شجر میں۔ صدف میں گہر ہیں
گہن میں اگر ہیں تو مثلِ قمر ہیں
اگر آہ و نالے میں ہیں تو اثر ہیں
نہاں نیشکر میں مثالِ شکر ہیں
کسی حال میں ہم نہیں پیچ و خم میں
یہی فرق ہے شاہ میں اور ہم میں

وہی نزع ہے اور وہی جاں کنی ہے
ولادت وہی ہے وہی مُردنی ہے
جو ہم پر وہی جانِ شر پر بنی ہے
فقط شاہ میں کبر ما و منی ہے
ہم آہ و فغاں میں وہ طبل و علم میں
یہی فرق ہے شاہ میں اور ہم میں

مگر کوئی مغلوب ہو یا کہ غالب
سیہ بخت یا کامیابِ مطالب

جُدا ہو گیا روح سے جب کہ قالب　　برابر ہوئے دونوں مطلوب و طالب
بالآخر گئے دونو یکساں عدم میں
رہا فرق کیا شاہ میں اور ہم میں

منشی و نائک پرشاد طالب بنارسی

مُبتلائے غم

منشی اصغر علی صاحب لکھنوی نے کچھ عرصہ ہوا مندرجہ ذیل قطعہ جناب حافظ جلیل صاحب جانشین امیر مینائی مرحوم کے کلام کا نمونہ ہمیں بغرض اشاعت عنایت کیا تھا جسے ہم آج بشکوری چھاپتے ہیں۔ اس قطعہ میں ایک مبتلائے غم کی تصویر ہے۔

یہ صبح صبح کدھر کا نسیم ارادہ ہے
بتا تو کونسا باغ آج تونے تاکا ہے

بہار شام اودھ کی ہے سیر مد نظر
سمجھ گیا میں تری چال سے یہ پیدا ہے

اگر یہ سچ ہے تو سن مجھ سے دیکھ میری طرف
وہ راستہ ہے جو پورب کی سمت جاتا ہے

اگر بھٹک نہ گئی راہ تو ملے گا تجھے
ادھر میں ایک چمن دل سا جو شگفتہ ہے

چمن نہیں ہے وہ اک حور زاد کی ہے گلی
گلی نہیں ہے وہ باغ ارم کا تختہ ہے

وہاں پہنچ کے ادب سے ذرا ٹھہر جانا
پکارنا پھر اُسے بڑھ کے جس کا کُوچہ ہے

کہ او فراق نصیبوں کے بھولنے والے
تجھے خبر نہیں دنیا میں ہو رہا کیا ہے

تجھے خبر نہیں کیا منتظر کی حالت ہے
تجھے خبر نہیں مر مر کے کون جیتا ہے

وہ رام پور جو ہے دور دور تک مشہور
میں کیا کہوں کہ وہاں میں نے کس کو دیکھا ہے

شکستہ حال سا ہے اک جوان عاشق تن
غریب ہے فلک پیر کا ستایا ہے

جگر پہ کھائے ہوئے ہے کسی کے عشق کی چوٹ
جو حال دل کا ہے آنکھوں سے وہ ٹپکتا ہے

نہ جانے کس نے کیا ہے اُسے شہید ادا
نہ جانے کون سا قاتل ہے جس پہ مرتا ہے

خیال یار میں ڈوبا ہوا ہے آٹھ پہر
نہ اپنا ہوش نہ اُس کو کسی کی پروا ہے

کبھی تو گرم ہیں نالے کبھی ہیں سرد آہیں
کبھی سکوت ہے ایسا کہ نقش سا ہوتا ہے

زبانِ حال سے کہتا ہے بیقرار ہوں میں — کبھی جگر پہ کبھی دل پہ ہاتھ رکھتا ہے
جہاں اِدھر کا کوئی شخص اُدھر کو جا نکلا — نگاہِ شوق سے گھڑیوں اُسے وہ تکتا ہے
جلیل کہتے ہیں اُسکو اگرچہ ہے وہ ذلیل — خراب حال ہے پہ آدمی وہ اچھا ہے
بہت ستاتی ہے جسوقت بیقراری دل — اِدھر کو ہاتھ اُٹھا کر یہ شعر پڑھتا ہے

بیا بیا کہ ترا تنگ در کنار کشم
بتنگ آمدہ ام چند انتظار کشم

حافظ جلیل - جانشین امیر مینائی

داغِ جگر

اے انقلابِ عالمِ فانی ہزار حیف　　اے اعتبارِ فصلِ جوانی ہزار حیف
باقی رہے ہیں سینہ میں اب تک دل و جگر　　اے تابِ ضبطِ سوزِ نہانی ہزار حیف
یہ کیا ہوا کہ خشک ہیں دامان و آستین　　اے ذوق و شوقِ اشک فشانی ہزار حیف
ہے آمد و شدِ نفسِ تنگ دل خراش　　اُس پر یہ سنگِ غم کی گرانی ہزار حیف
کیا ہو گئی وہ لذّتِ تقریر کیا ہوا　　کیا ہو گئی وہ سحر بیانی ہزار حیف
دیتا ہے کون دادِ ستمہائے آسماں　　سنتا ہے کون غم کی کہانی ہزار حیف
اندازِ دلفریبیٔ دنیا ہزار تف　　ارمانِ عیش و لذّتِ فانی ہزار حیف
اے آرزوئے عالمِ اسباب صد دریغ　　اے حرصِ تخت و تاجِ کیانی ہزار حیف

اُمیدوارِ کانِ صدائے درا کے ہیں
دنیا کے رہنے والے مسافر سرا کے ہیں

شورِ فغاں میں جو اثرِ نفخِ صور تھا　　تھا تیرا روزِ مرگ کہ یوم النشور تھا
جب یہ سُنا کہ آج زمانہ میں تم نہیں　　دل میں نہ تھا سرور نہ آنکھوں میں نور تھا
رہتے تھے میرے گھر میں جو ذرّات روشنی　　اے شمعِ حُسن سب یہ تمہارا ظہور تھا
ثابت ہوا وہ شب تھی تمہاری شبِ وفات　　جس رات بیقرار دلِ ناصبور تھا
ہنگامِ نزع حسرتِ دیدار رہ گئی　　مجبور تھا کہ تم سے میں کمبخت دُور تھا
مشتاق رہ گیا ہے غریب الوطن پدر　　اکبار اُس کو شکل دکھانا ضرور تھا
ہو جائے گا شمار میرے دل کے داغ سے　　جو عمر میں حسابِ سنین و شہور تھا
اے شمعِ صبح تک تیری رونق کہاں رہی　　اس ہستیٔ قلیل پہ کتنا غرور تھا

دنیا کا لُطف تیری جدائی میں کچھ نہیں

جب تو نہیں تو ساری خدائی میں کچھ نہیں

دم توڑو تم اور آنکھ سے دیکھا کرے کوئی
پتھر کا کس طرح سے کلیجا کرے کوئی

جب تم بھی آنکھ پھیر لو ناشاد یاس سے
پھر یہ بتاؤ کس کا بھروسہ کرے کوئی

ہے زندگی میں موت کا دھڑکا لگا ہوا
کیا قدر ولفریبی دنیا کرے کوئی

نازک مزاج تم سا جو مل جائے خاک میں
پھر خاک زندگی کی تمنا کرے کوئی

آنکھیں میری ہیں کیوں نہ رؤں کس کی تم کو کیا
کیوں تجھ سے ضبطِ غم کا تقاضا کرے کوئی

کیوں مجھ کو صبر کی ہو ہدایت میں کیوں سنوں
کیوں میرے اضطراب کو روکا کرے کوئی

مجھ کو نہیں تحمّل احسان چارہ ساز
کیوں میرے درد دل کا مداوا کرے کوئی

تاخیر کیوں نزول بلا میں ہے کیا ہوا
اب کب تک آسمان کو دیکھا کرے کوئی

ممکن نہ تھا یہ جبر کبھی اختیار میں
پر دخل کیا مشیّت پروردگار میں

جز مرگ اب تو دل میں کوئی آرزو نہیں
افسوس ہم جہان میں ہیں اور تو نہیں

میں مر ہی جاؤں گا جو لگے گی ذرا سی ٹھیس
اے چارہ گر خدا کے لئے زخم چھو نہیں

کیا تھی خبر قضا کا فرشتہ ہے گھات میں
ہم جانتے تھے کوئی تمہارا عدو نہیں

پاؤں پہ گر کے کرتے سفارش عدو سے ہم
پر کیا کریں کہ اُس میں مروّت کی خو نہیں

کیا ڈھونڈتے ہیں اشک جو بہتے ہیں خاک میں
یہ بھی کھو گئے تم کہ میری جستجو نہیں

کیسی ہوا چلی ہے گلستان دہر میں
پھولوں کو سونگھئے تو محبت کی بو نہیں

دیوانہ ہو گئے ہیں یہ کمبخت چارہ ساز
میرے جگر کے زخم میں جائے رفو نہیں

گردش نے آسماں کی ملایا ہے خاک میں
پھر کیوں گلا اس کے دور پہ کیجے تفو نہیں

پہلو میں لیکے میری عبارت گذار کو
کیا آج ناز ہوگا زمین مزار کو

کیونکر بسر ہو زیست کہ چارا نہیں رہا
جب تم نہیں تو کوئی ہمارا نہیں رہا

ہو گی وطن میں جا کے کبھی دید و باز دید
اتنا بھی اب تو ہم کو سہارا نہیں رہا

چمکیں فلک پہ روز ستارے تو کیا غرض — جب تو ہماری آنکھ کا تارا نہیں رہا
چھائی ہوئی ہے بزم جہاں پر فسردگی — آخر یہ کون انجمن آرا نہیں رہا
سر کیا کروں کہ سر میں وہ سودا کہاں ہے اب — دل کیا کروں کہ اب وہ دل آرا نہیں رہا
غنچے فسردہ ہو گئے بادِ سموم سے — باغ جہاں میں اب وہ نظارہ نہیں رہا
دنیا اگر ہو محو تواضع تو کیا خوشی — بے تیرے لطفِ لطف و مدارا نہیں رہا
اللہ تو مجھے بھی اُٹھا لے تو خوب ہے — اب مجھ میں غم اُٹھانے کا یارا نہیں رہا

ہے ہے ابھی جہاں سے گذرنے کے دن نہ تھے
یہ کھیلنے کی فصل تھی مرنے کے دن نہ تھے

تاریک ہو گیا ہے زمانہ نگاہ میں — یارب ہے کس بلا کا اثر دودِ آہ میں
اے حاملانِ میّت معصومہ دیکھنا — آنکھوں کا فرش ہم نے بچھایا ہے راہ میں
آخر ہوا عروج جوانی پیامِ مرگ — نقصان ہے کمال جو پیدا ہو ماہ میں
اے روشنی داغ جگر تو نے کیا کیا — دھبّہ لگا دیا میرے روزِ سیاہ میں
کنجِ مزار میں تمہیں کس طرح چین آئے — راحت کہاں ملی مہ کنعاں کو چاہ میں
اہلِ عزا کا کس نے کلیجا ہلا دیا — کیسا اثر تھا اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ میں
اَحسن وفورِ گریہ نے عصیاں کو دھو دیا — کچھ بھی نہیں رہا میری فردِ گناہ میں
عہدِ وفا کو اہلِ مُروّت نہ توڑتے — رخنہ اجل نے ڈال دیا ہے نباہ میں

آلودہ گو کہ خاک میں جسمِ نفیس ہے
تُربت قریب قبر جناب نفیس ہے

بس اے ہجوم حسرت و غم آہ الغیاث — باقی نہیں ہے چشم میں نم آہ الغیاث
گر بیٹھنے کا قصد کروں بیٹھ جائے دل — اُٹھنے میں کانپتے ہیں قدم آہ الغیاث
بے راحلہ یہ سخت سفر اور یہ بے کسی — ہے ہے مسافرانِ عدم آہ الغیاث
اہلِ وفا میں طرزِ تغافل ہزار حیف — اہلِ کرم میں شیوۂ رم آہ الغیاث
بیتابی و طپش قلق و اضطراب و درد — اک جانِ ناتواں پہ ستم آہ الغیاث

تم کو جوان ہونیسے پہلے ہی موت آ ئی ‏ ‏ ‏ زندہ رہے جہاں میں ہم آہ الغیاث
حوریں شریک ماتم مرگ جواں ہیں آج ‏ ‏ ‏ کہتے ہیں اہل خلد بہم آہ الغیاث
اے یادگار احسنِ خستہ جگر دریغ ‏ ‏ ‏ اے وجہ حسرت اب دام آہ الغیاث

افراطِ حزن مانع آرام و خواب ہے
احسن بھی اب مسافر پا در رکاب ہے

مشرقی ادب کا پژمردہ باغ

تباہ حال ہے ہندوستان میں لٹریچر — بہار کا نہیں پاتے ہیں اس چمن میں گذر
پڑے ہیں اُجاڑ ہیں جو تھے ہرے بھرے گلشن — ہوا نے جڑ سے اُکھاڑے جو تھے قدیم شجر

ہیں بلبلوں کی جگہ چند تتلیاں اڑتیں — نسیم صبح کے گھر میں ہے چل رہی صرصر
ہیں نونہالِ چمن علم سے پھلے پھولے — مگر مٹھاس کا پاتے نہیں پھلوں میں اثر

ہر ایک باغ میں ہے اک نئی ہوا چلتی — چمن میں پھول ہیں لیکن بہار ہے باہر
نہ ہندوؤں میں نظر آئے بالمیک کوئی — نہ ہم میں پائیں متنبی و فیضی و جعفر

نہیں ہے ایک بھی تلسی کا مثل بھاشا میں — نہ پارسی میں ہے خسرو کا دوسرا ہمسر
انیس و غالبِ مرحوم کی جگہ کوئی — نکل سکے نہ صد افسوس اردو زباں آور

ہے سنسکرت زمانے میں ماں زبانوں کی — مگر ہے اب تو وہ بیکنٹھ باش سر تا سر
اُسی کی بیٹی نے مارا ہے اس کو گر دیکھو — ہوتی ہے مار کے بھاشا اُسے زباں آور

نہ ہم کو نحو و عروضِ سخن میں جان کاہی — نہ ہندوؤں کو توجہ نیائے و پنگل پر
نہ بولتے ہیں پپیہے صدائے دلکش سے — نہ قمریوں کے ترانوں میں وجد کا ہے اثر

کنول کے پھول کھلے ہیں مگر ہیں پژمردہ — کھڑا ہے حوض میں لیکن فسردہ نیلوفر
ہزار طرح کے پھل ہیں مگر مٹھاس نہیں — ہزار طرح کے گل ہیں مگر نہیں گلِ تر

ہے بالمیک کی تصنیف قالبِ بیجاں — نہ پہنچے بام پہ اُس کے کمندِ اہلِ نظر
مصنفین ہیں بھاشا کے ہیں جو تلسی داس — ورق طلا کے ہیں اُن کے لکھے ہوئے پتر

مگر ہیں اس میں بھی جو استعارہ ہائے ادب — وہ میل کھائیں نہ انگلش مذاق سے یکسر
ادب سے پہلے تھا وابستہ دھرم کرم بہا — نہ پاس آنے دے اس کو جدید لٹریچر
گریجویٹ جو نکلے ہیں یونیورسٹی سے — دلوں میں اُنکے نہیں اُس مذاق کا ہی اثر

جو نغمہ سنجِ طرب تھیں وہ اُڑ گئیں چڑیاں
جو نکتہ دانِ ادب تھے وہ اُڑ گئے طائر

زبان میں حس ہی نہیں ہے تو ذائقہ کیسا
نہیں مشام تو پھر کیا شمامۂ عنبر

چمن وہی ہے مگر بلبلیں نہیں ویسی
نچے پڑے ہیں کہیں کیاریوں میں اُنکے پر

اثر نہ پوت میں موتی کا ہو سکے پیدا
نہ پائیں لوہے میں فولاد کے کبھی جوہر

ہر ایک چوب نہ تاثیر بن بنے صندل
ہر ایک پھول میں آئے گلاب کا نہ اثر

دل و دماغ نہ باقی رہے ہوں جب اگلے
تو اُن سے کام بتاؤ وہ ہو سکے کیونکر

جو پہلے فضل و ادب کے تھے مقصدِ عظمےٰ
وہ اب ہیں خانہ برانداز صاحبانِ ہنر

نہ سلطنت کو ہمارے ادب کی کچھ پروا
نہ سلطنت کی صداؤں کے ہم سخن گستر

نہ کچھ خدا سے علاقہ نہ دیوی دیوتا سے
نہ آج کام کے اوتار ہیں۔ نہ پیغمبر

نہ راج نیتی میں اپنی زباں کا کچھ حصّہ
نہ ہم فرائض اعلےٰ میں صاحب دفتر

نہ شمعِ حسنِ ازل سے ہماری لو ہے لگی
نہ ہیں مناظرِ حسنِ کمال پیشِ نظر

اُردُو

میں اب دکھاتا ہوں اردو کی حالتیں تم کو
جو عام طور سے دیکھے ہر ایک اہل نظر

ہے ہندوؤں کیلئے کنیا یہ کلجگ کی
ہماری قوم کو دوشیزہ حاملِ محشر

اُصولِ السنہ اس پر ہیں حجت ناطق
کہ اِس زباں کے نہ ہو دوسری باں ہمسر

حروف سب سے زیادہ ملے ہیں اردو کو
نہیں کثیر سے الفاظِ السنۂ اکثر

زیادہ لفظوں سے جملے زیادہ ہوں پیدا
اسی قدر ہوں تکلم میں وسعتیں ظاہر

ہر ایک بیج ہے اسکی زمیں میں کھپ جاتا
ہر ایک تخم ہو نشو و نما سے بارآور

جو دیکھیے عربی سنسکرت بھاشا کو
تو اُن کو غیر کی صحبت سے پائیے گا حذر

مگر نہیں اُسے کچھ دوش انکے ملنے سے
نہ یہ تعصبِ مذہب کی عادتاً خوگر

جو کام سہل ہے اُس کو وہ غیر کو مشکل
جو کام غیر کو آساں وہ اس کو آساں تر

نہ ایک نثر ہی مجموعۂ تکلّم ہے
ہے جامعِ سخنِ عام نظم کا دفتر

بڑے بڑے ادبا اُس کے ناقلِ معنے
بڑے بڑے علما اس کے قائلِ جوہر

ذرا بتاؤ تو ہندی میں لکھ کے دیکھیں تو
ہوں کلیّات ہیں جس کے بیتیں مضمر

نہ ایک جملہ سے پیدا ہوں اس قدر معنے
نہ یوں تلفظ الفاظ ہو سخن گستر

عرب کے لفظ عجم کے زباں کی یہ حامل
زبانِ انگلش و بھاشا کی ناقلِ دفتر

نہ لکھ سکیں اُسے اہلِ مقدمہ ایسا
نہ پڑھ سکیں اُسے اہلِ معاملہ فرفر

یہی زباں ہے زمانہ کے ساتھ چل سکتی
نہیں ہے جس میں تعصّب کا نام کو عنصر

نہیں ہے واسطۂ خاص اس کو مذہب سے
نہ ایک مذہب و ملت کی یہ ہوئی خوگر

کوئی زبان نہیں اس کے سوا یہاں ایسی
جو سب زبانوں میں ملجائے جیسے شیر و شکر

ہیں اس کے پیٹ میں کن کن کے سارے گن پیدا
اگرچہ ہو نہ یہ نرگن کی آشنا یکسر

یہی زبان ہے انگلش کے ساتھ چل سکتی
اسی زبان میں ہو ہر زبان سخن پرور

سوائے اُس کے علوم و فنون انگلش کا
کوئی زباں نہ کرے اس سے ترجمہ بہتر

غضب ہے ملک اگر اس کی اب نہ قدر کرے
کرے گا ظلم جو اس پہ وہ ہے ستم خود پر

ہمارا دیس

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا   ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں   سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا   وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں   گلشن ہے جنکے دم سے رشک جناں ہمارا
اے آب رودِ گنگا وہ دن ہے یاد تجھ کو   اُترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا   ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے   اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری   صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

سپوت بیٹا

آتا ہے ہند سے نواے نوجوان سپاہی — مجھ کو بھی کچھ بتا جا ۔ رکھے تجھے الٰہی
انیسویں کی پلٹن ہے اک وہاں بہادر — جس کا ہر ایک سپاہی مشہور ہے دلاور
کچھ اُن کا حال کہنا اور مجھ کو یہ بتانا — کیا ہیں وہ سب سلامت اور خرّم و توانا
بیٹا میرا ہے اُن میں ۔ میرا عزیز لڑکا — جس کی ہے سب سے بڑھ کر دنیا میں مجھکو پروا
احسان کرے گا ماں پہ اُس کی خبر بتا کر
لے رانڈ کی دعائیں اُس کی خبر سنا کر

آتا ہوں ہند سے میں ۔ موجود جنگ میں تھا — حصّہ میرا بھی اُس جا تیر و خدنگ میں تھا
انیسویں جو پلٹن ہے خوب جانتا ہوں — اُس کے سپاہیوں کی جرأت کو مانتا ہوں
افسر ہوں یا سپاہی سب سے ہوں میں شناسا — ہمراہیوں سے اپنے ہر اک ہے دوست میرا
لایا پیام ہوں اک تیرے لئے بڑی ماں
رابرٹ کا تیرے پیغام ۔ خوش خوش سنو بڑی ماں

رابرٹ کو میرے تم کیا پہچانتے ہو بیٹا؟ — سچ سچ بتانا جو کچھ تم جانتے ہو بیٹا
اے نیک خو سپاہی اس کا پیغام کیا تھا — کہنا اُسی کے الفاظ اُسکا کلام کیا تھا
ہائے وہ لفظ کہنا جو اُسکے منہ سے نکلے — لختِ جگر کے میرے جو اپنے منہ سے نکلے
تجھ کو خبر نہیں وہ ۔ کیسا مجھے ہے پیارا — اپنی ضعیف ماں کی ہے ۔ آنکھ کا وہ تارا
فرقت میں اُسکی ماں کا کیا حال ہو رہا ہے
یہ دل میرا غموں سے ۔ پامال ہو رہا ہے

ہیولاک کی لڑائیاں اُس نے لڑی ہیں ساری — دشمن پہ وار سارے اُسکے ہوئے ہیں کاری
دو بار لکھنؤ پر وہ چڑھ کے خواب اڑا ہے — تلوار سے لڑا ہے اور توپ سے لڑا ہے

کر شکر اُس خدا کا جس نے اسے بچایا
ہر معرکے میں اُس پر حق کا رہا ہے سایا

صد شکر یا الٰہی۔ طاقت نہیں بیاں کی — تو نے سُنی دعائیں اُس کی غریب ماں کی
اے دو جہان کے مالک اے کردگار میرے — اس رانڈ ناتواں کی سُن لی۔ نثار تیرے
گولے کی زد سے روکا تلوار سے بچایا — اپنے کرم کا نقشہ دل پر میرے جمایا

پر ہاں مجھے بتا دے پیغام اُسکا کیا تھا
اپنی ضعیف ماں کو کہنے کو کیا کہا تھا

"اے ماں بہادری سے تیرا لڑا ہے لڑکا — اور ہر زباں پہ اُسکا پھیلا ہوا ہے چرچا
کرنل کی جاں کو اُس نے رن میں بچا لیا تھا — سرکار میں یہ قصہ سارا لکھا گیا تھا
اس کے صلے میں اسکو تمغہ عطا ہوا ہے — زائد برآں وظیفہ اُس کو دیا گیا ہے

ہے خوش نصیب لڑکا تیرا بہت بڑی ماں
خوش قسمتی کا اُس کی تارا ہے درخشاں

"اے نیکدل سپاہی تیری زباں پہ رحمت — جس خاندان کا ہے تو اُس خاندان پہ رحمت
اے پیارے مرنے والے تو کاش آج ہوتا — اس میرے جھونپڑے میں کیا رنگ آج ہوتا
دکھ درد جو سہے تھے سب محو ہو گئے ہیں — سالوں کے رنج و غم کو یہ لفظ دھو گئے ہیں
پر ہاں ابھی تو باقی کچھ پوچھنا تھا تم سے — حالت تھی اُس کی کیسی اور کیا کہا تھا تم سے

رابرٹ کا حال کیا تھا اور رنگ روپ کیا تھا
للہ مجھے بتا دو تم سے جو کچھ کہا تھا

"سرخی سے اُسکی رنگت تانبا سی ہو رہی ہے — ڈاڑھی نکل کے خوبی عارض کی کھو رہی ہے
ایسا بدل گیا ہے وہ نازنین شمائل — پہچان اُس کی اماں تم کو بھی ہو گی مشکل
مرد جواں گیا ہے ہم نے تمہارا بچہ — دل اُس کا پر وہی ہے ہرگز نہیں ہے بدلا
رکھتا ہے یاد تجھ کو۔ کرتا ہے تیری باتیں — اور جانتا نہیں ہے وہ ایسی ویسی باتیں

لیکن جہاز اُس کا سمجھو لگا کنارے

جلدی ہی خود ملے گا وہ آکے تم کو بارے

کب میرا پیارا ننھا دیدار دے گا مجھکو
ہیں سچ مچ آ رہا ہے سچ مچ ملیگا مجھکو؟"

تم نے کہا تھا جلدی آیا وہ چاہتا ہے
جھوٹا نہیں ہیں اماں سچ مچ وہ آچکا ہے

"او میرے پیارے رابرٹ! اماں تمہاری واری
او ماں میں تیرے قرباں۔ حق نے سنی ہماری

رات کے بے چین گھنٹے

دنیا تمام غفلت کی نیند سو رہی تھی
اور شورشِ جہاں تک خاموش ہو رہی تھی

سناٹا کل فضائے عالم پہ چھا چکا تھا
پچھلے پہر کا گھنٹہ بارہ بجا چکا تھا

وقتِ رواں کا ہر دم ہوتا تھا یہ اشارہ
اے سونے والو دیکھو تم مجھ کو آشکارا

میرا قدم ازل سے کل کائنات پر ہے
اک نقش پا ہے دن پر اور ایک رات پر ہے

خمخانۂ فلک میں رندوں کا جمگھٹا تھا
محفل سکوت کی تھی اور دور چل رہا تھا

چوٹی سے کوہ نو کی تھی جیسے نور جاری
اور روشنی کا گویا برسا رہی تھی پانی

میں نے جو غور کر کے دیکھا تو چاند تھا وہ
بادل کی جھاڑیوں میں تھا راہ ڈھونڈھتا وہ

تنہائی محض نے تھا ایسا مجھے ابھارا
بے اختیار ہو کر میں نے اسے پکارا

اے پھرنے والے دشت غربت میں آسماں کے
اے راہ نورد یوسف انجم کے کارواں کے

اے رات کے مسافر بے زادِ راہ و ساماں
کس منہ سے اپنے گھر ہم تجھ کو بلائیں مہماں

گھر کیسا؟ آہ گھر بھی تو یاں نہیں کوئی ہے
ہر شئے میں غیریت ہے ہر چیز اجنبی ہے

لیکن نہیں بٹانے کو تیرا ہاتھ میں ہوں
چل جس طرف کو چلتا ہے تیرے ساتھ میں ہوں

اس دیس میں ہوا ہوں آ کر تباہ میں بھی
تیری طرح چلا ہوں بے زادِ راہ میں بھی

پھرتا ہوں زندگانی کے توسنِ رواں پر
اک پانوں ہے زمین پر اور ایک آسماں پر

تیری طرح ابھر کر جاتا ہوں ڈوب میں بھی
یعنی طلوع ہوتا ہوں اور غروب میں بھی

گھیرے ہوئے مجھے بھی تاریکیِ محن ہے
تیری طرح سے میرے بھی واسطے گہن ہے

یعنی ہوں گاہ روشن اور گاہ ماندہ میں ہوں
بس ایک چاند تو ہے اور ایک چاند میں ہوں

تو وہ کہ تجھ سے روشن رہتی ہے آدھی دنیا
میں وہ کہ مجھ سے رونق پکڑے ہے ساری دنیا

ساری زمین پر انجم ہے میری روشنی سے
دن ہو رہا ہے میری بجلی کی روشنی سے

اے ماہِ آسماں من آں ذرّۂ زمینم
صد ماہ چوں تو پنہاں در جیب و آستینم

اے چاند حال میرا تجھ سے چھپا نہیں ہے
تو اور میں ہوں کوئی یاں دوسرا نہیں ہے

یہ سب تو شاعرانہ میری تعلّیاں تھیں
لفاظیاں تھیں اور سب رنگین بیانیاں تھیں

سن کان دھر کے اپنی بیتی تجھے سناؤں
میرا تو حال یہ ہے میں تجھ سے کیا چھپاؤں

طوفان کا جیسے مارا ساحل کو ڈھونڈتا ہو
یا وہ تھکا ہوا جو منزل کو ڈھونڈھتا ہو

یا جیسے وہ پتنگا جو کھیل جائے جی پر
اور دوڑ کر گرے جو شعلے کی روشنی پر

یا جس طرح وہ بیوہ جو غم میں جل رہی ہو
اور خاک اپنے شوہر کی جو کریدتی ہو

صدیاں گذر گئی ہیں مجھ کو تلاش کرتے
خالق کو اور اس کے اسرار فاش کرتے

جانچی ہیں میں نے برسوں خورشید کی شعاعیں
ذرّوں پہ میں نے برسوں دوڑائی ہیں نگاہیں

تہ تک سمندروں میں غوطے لگا گیا ہوں
پاتال تک زمین کے اندر چلا گیا ہوں

تحت الثّریٰ سے گذرا اڑتا زقند بھرتا
افلاک پھاڑتا اور اجسام قطع کرتا

چمکا کبھی اُفق پر خورشید شرق بن کر
تڑپا کبھی فضائے عالم میں برق بن کر

اونچا بہت غباروں میں بیٹھ کر اڑا ہوں
بادل میں چھپ گیا ہوں تاروں میں مل گیا ہوں

سیر عدم کر آیا میں اسپیشل اوڑاتا
گذرا صراط پر سے بائیسکل اوڑاتا

جنت میں جا کے وعدے لے آیا حوروں سے میں
دوزخ کا دیکھ آیا دروازہ دور سے میں

شمس و نجوم کی میں رفتار دیکھ آیا
اور کائنات کے کل اسرار دیکھ آیا

کیا دورۂ کواکب اور کیا قیام شمسی
دیکھا پڑا ہے میرا سارا نظام شمسی

گردش کی شکل میں نے اس طرح کھینچ دی ہے
گویا زمین میری انگلی پہ گھومتی ہے

دنیا کا کام سارا تجھ سے نکل رہا ہے
یہ کارخانہ میرے پرزوں سے چل رہا ہے

لیکن تمام اس سرگردانی کا نتیجہ
یہ ہے کہ سر جھکائے افکار میں ہوں بیٹھا

تحقیق اور تجسّس کے دام میں پھنسا ہوں
وسواس میں گھرا ہوں اوہام میں پھنسا ہوں

کہنے کو ہوں میں فارغ کہلانے کو ہوں کامل
جو چیز ہے فراغت مجھ کو کہاں ہے حاصل؟

سب زندگی کی خوشیاں ہیں خاک میں ملا کر — بیٹھا ہوں دونوں ہاتھوں پر اپنے دھرے ہوئے سر
صحرا میں آہ آہو بھرتے ہیں جب کلیلیں — بے فکر ہو کے جب وہ سبزے پہ لوٹتے ہیں
گرتے ہیں جبکہ بھونرے پھولوں کی جام مل پر — جب بلبلیں مچاتی ہیں شور شاخِ گل پر
چشموں پہ غول باندھے چڑیاں جب آ گری ہیں — جب وہ پروں سے اپنے پانی اچھالتی ہیں
اُسوقت میرے دل پر اک ابر چھا گیا ہے — اور وہ برس کے گھنٹوں مجھ کو رولا گیا ہے
اُسوقت میں نے جانا ہے زندگی یہی ہے — اصلی خوشی یہی ہے زندہ دلی یہی ہے
پھر سوچ کر کہ میرا کیا حال ہے میں کیا ہوں — بس چونک سا گیا ہوں ایسا کہ چیخ اُٹھا ہوں
باز آیا علم و فن کی میں ایسی روشنی سے — گذرا میں ایسے جینے اور ایسی جانکنی سے
اے لذتوں کے پھندو تم میری جان چھوڑو — اے حوصلہ مجھے تم کوئی تو آن چھوڑو
اے علم میں فضیلت سے تیری باز آیا — اے عقل میں ہدایت سے تیری باز آیا
روز ایک نہ اک بکھیڑا تو نے لگا دیا ہے — جب تو نے رائے دی ہے مجھ کو پھنسا دیا ہے
اے عشق جان تجھ سے اپنی بچا رہا ہوں — اے شوق تجھ سے پیچھا اپنا چھڑا رہا ہوں
جس راہ تم نے چاہا ہے مجھ کو لے چلے ہو — تم کھینچتے چلے ہو تم پھیلنے چلے ہو
آہ اے اُمید تو نے مجھ کو بہت تھکایا — اے آرزو کے پودو کچھ تم سے پھل نہ پایا
اے جذبِ حسن اور اے جوشِ شباب رخصت — اے ذوق و شوقِ عشقِ خانہ خراب رخصت
بس اے عروسِ دنیا اب میں الگ رہوں گا — اب اے بہشت تجھ کو میں لیکے کیا کروں گا

در محفلے کہ یاراں شربِ مدام کردند
چون نوبتِ من آمد آتش بجام کردند

اے چاند ڈوبتے ہیں اور میں بھی تھک گیا ہوں — یہ نیند کا نشہ ہے جو کچھ بہک گیا ہوں
غمنامہ سن چکا تو میرا میری زبانی — زنہار تو کسی سے کہنا نہ یہ کہانی
تو شورشِ جہاں میں مُہرِ سکوتِ شب ہے — لوحِ طلسم ہے تو ٹوٹا تو بس غضب ہے
ہیں سربمہر قدرت کے راز تیری سر میں — اس میکدے کی کنجی ہے تیری ہی کمر میں
میں ہوں کلیم تیرا اور شمعِ طور تو ہے — نادر کے مالِ یغما میں کوہِ نور تو ہے

پروانہ ہیں ازل سے تیرے چراغ کا ہوں — بچپن سے جرعہ کش ہیں تیرے ایاغ کا ہوں
اے جامِ خوابِ راحت میرے قریب آجا — آنکھوں میں میری مل جا دل میں مرے سما جا
یہ تھوڑی رات جو ہے کٹ جائے مجھ کو سوتے — اور تازہ دم میں اُٹھوں ایسا کہ صبح ہوتے
رکھ دوں طلسمِ سحرِ ظلمت کو توڑ کر میں — موتی کی طرح نکلوں دامن نچوڑ کر میں

بس آنکھ بند کر کے خاموش ہو گیا میں
دو جھونکے ایسے مجھکو آئے کہ سو گیا میں

نیا شوالہ

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے

کچھ فکر پھوٹ کی کر مالی ہے تو چمن کا
بوٹوں کو پھونک ڈالا اس بس بھری ہوا نے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

آمل کے غیریت کے پردوں کو پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقش دوئی مٹا دیں

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے جی کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامان آسماں سے اس کا کلس ملا دیں

پھر اک انوپ ایسی سونے کی مورتی ہو
اس ہردوار دل میں لا کر جسے بٹھا دیں

سندر ہو اس کی صورت چھب اس کی موہنی ہو
اس دیوتا سے مانگیں جو دل کی ہوں مرادیں

زنار ہو گلے میں تسبیح ہاتھ میں ہو
یعنی صنم کدے میں شان حرم دکھا دیں

پہلو کو چیر ڈالیں درشن ہو عام اس کا
ہر آشنا کو گویا اک آگ سی لگا دیں

آنکھوں کی ہے جو گنگا لے لے کے اس سے پانی
اس دیوتا کے آگے اک نہر سی بہا دیں

ہندوستان لکھ دیں ماتھے پہ اس صنم کے
بھولے ہوئے ترانے دنیا کو پھر سنا دیں

ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

مندر میں ہو بلانا جس دم پجاریوں کو
آوازہ اذاں کو ناقوس میں چھپا دیں

اگنی ہے وہ جو نرگن کہتے ہیں پیت جس کو
دھرموں کے یہ بکھیڑے اس آگ میں جلا دیں

ہے ریت عاشقونکی تن من نثار کرنا
رونا ستم اٹھانا اور ان کو پیار کرنا

اقبال

پھول اور پیام

(انگریزی سے ترجمہ)

جاؤ گلِ گلاب تو کارِ ثواب کو ۔ میرا پیام دے میری عصمت مآب کو
کیوں مفت کھو رہی ہے وہ یوں وقتِ مغتنم ۔ کیا جانتی نہیں وہ کہ فرصت بہت ہے کم
اس وقت آتشیں ہیں وہ رخسار پھول سے ۔ منہ سے بھی جھڑتے ہیں دمِ گفتار پھول سے
گر وہ ہے شمعِ حسن تو پروانہ میں بھی ہوں ۔ ہے وہ پری جمال تو دیوانہ میں بھی ہوں
لازم ہے شکرِ نعمتِ پروردگار اُسے ۔ واجب ہے فکرِ گردشِ لیل و نہار اُسے
کیا مال ہے یہ حسن اگر قدرداں نہ ہو ۔ مجنوں نہ ہو تو لیلیٰ کی بھی داستاں نہ ہو
اے گل تو ہی بتا کہ تجھے گر بجائے باغ ۔ بہرِ نشیمن آج ملا ہوتا کوئی زاغ
خوبی کو تیری دیکھنے والا بھی تھا کوئی ۔ سو جان سے تیرا والہ و شیدا بھی تھا کوئی
ایسا ہی وہ میری سیمیں اندام نازنیں ۔ جنگل میں کوہ و دشت میں ہوتی اگر کہیں
اہلِ نظر کی جس جگہ ہوتی نہ دسترس ۔ اور ایکساں ہی ہوتے جہاں ناکس و کس
واں جنسِ حسن ہوتی خریدار بن پڑی ۔ اور دلربا وہ ہوتی طلبگار بن پڑی
پیغام میرا دے کے اُسے اے گلِ گلاب ۔ مرجھانا بیدریغ۔ وہیں کھا کے پیچ و تاب
شاید کہ تیرے مرنے سے ہشیار ہو کے وہ ۔ انجامِ حسن دیکھ لے بیدار ہو کے وہ
جانے کہ کوئی گل کا سا رنگیں قبا بھی ہو ۔ شیریں سے بڑھ کے گو کوئی شیریں ادا بھی ہو
قبضے میں اُس کے حسن کا حصہ ہے چند روز ۔ دنیا میں حسن و عشق کا قصہ ہے چند روز
جو فائدہ اٹھانا ہو اُس سے اٹھائے جلد ۔ دل میں سما چکی ہے نظر میں سمائے جلد

راقم نظر انتخاب

غزلیات

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن وہ اکثر یاد آتے ہیں
الٰہی ترکِ الفت پر وہ کیونکر یاد آتے ہیں

سکونِ خاطرِ ناکام کی تکلیف کیا کہئے
جنون و وحشت و فصّاد و نشتر یاد آتے ہیں

نہ چھیڑ اے ہمنشیں کیفیت صہبا کے افسانے
شرابِ بیخودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں

رہا کرتے ہیں قیدِ ہوش میں اے وائے ناکامی
وہ دشت خود فراموشی کے چکّر یاد آتے ہیں

خیالِ یار کا دل سے خفا ہونا قیامت ہے
کسی کے عشوہ ہائے ناز پرور یاد آتے ہیں

نہیں آتی تو یاد اُنکی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

اسی پر ناز تھا حسرت تجھے ترکِ محبّت کا
تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھ کر یاد آتے ہیں

حسرت موہانی

کٹ گئی بے مدعا ساری کی ساری زندگی
زندگی سی زندگی ہے یہ ہماری زندگی!

کیا ارادوں سے ہی حاصل؟ طاقت و فرصت کہاں؟
ہائے کہلاتی ہے کیوں بے اختیاری زندگی

اے سرِ شوریدہ اب تجھے وہ سودا کیا ہوئے؟
کیا سدا سے تھی یہی غفلت شعاری زندگی

دردِ الفت کا نہ ہو تو زندگی کا کیا مزا؟
آہ و زاری زندگی ہے بیقراری زندگی

آرزوئے زیست بھی یاں آرزوئے دید ہے؟
تو نہ پیارا ہو تو مجھ کو ہو نہ پیاری زندگی

اور مرجھائیگی تیری چھیڑ سے دل کی کلی
کر نہ دو بھر مجھ پہ اے بادِ بہاری زندگی

یاں تو اے نیرنگ دونو کے لئے ساماں نہیں
موت بھی مجھ پہ گراں ہے گو ہے بھاری زندگی

(نیرنگ)

جسم کا ساتھ چھٹا آپ سے باہر ہم ہیں — اب تو اپنے لئے اک غیر سے بدتر ہم ہیں
جلوۂ یار پہ ٹھہری رہیں تا دیر آنکھیں — نہ خدا ہیں نہ امام اور نہ پیمبر ہم ہیں
کان مشتاق ہیں آنکھوں کی طرح مدت سے — دیدۂ آواز کہ اس پردہ کے اندر ہم ہیں
تھک گئے پاؤں گئی دربدری شکرِ خدا — اب یوں ہی تا بہ قیامت ترے در پر ہم ہیں
تا قیامت رہے آئینہ سلامت یا رب — ہر حسیں کو ہے یہ دعویٰ کہ سکندر ہم ہیں
دشتِ اُمید کی جانب جو بڑھاتے ہیں قدم — موت کہتی ہے یہ آہستہ کہ سر پر ہم ہیں
فکر کر رکھتی ہے سرما کے لئے گرما میں — ایک چیونٹی سے بھی تدبیر میں کمتر ہم ہیں
عقل سے راہ جو پوچھی تو پکارا یہ جنوں — وہ تو بھٹکی ہوئی خود پھرتی ہے رہبر ہم ہیں
دل یہ کہتا ہے ہمیں دیکھ کنایوں پہ نہ جا — قدرتِ صانعِ مخلوق کے دفتر ہم ہیں

پھر تو ہو جائیں گے بازارِ جہاں میں مہنگے
شادؔ ارزاں ہیں جبھی تک کہ میسر ہم ہیں

(شادؔ عظیم آبادی)

راحتیں طولِ مرض کی صرفِ درماں ہو گئیں — زندگی جن مشکلوں سے تھی وہ آساں ہو گئیں
صورتیں اُمید کی خوابِ پریشاں ہو گئیں — سامنے آنکھوں کے آئیں اور پنہاں ہو گئیں
کچھ دنوں وعظ نے جنکا خود کیا تھا التزام — اب وہ تکلیفیں سراسر جزوِ ایماں ہو گئیں
اُن سے کیا لُطف تعلق اُن سے کیا دلبستگی — غیر کے ماتم میں جو زلفیں پریشاں ہو گئیں
عالمِ غربت میں وہ یادِ وطن کی لذتیں — رفتہ رفتہ نذرِ شوقِ خانہ ویراں ہو گئیں
بے تمرمت سی جو قبریں کوچۂ وحشت میں تھیں — وہ بھی آخر صرفِ استحکامِ زنداں ہو گئیں
ناخنِ وحشت نے سینہ پر جو کیں گلکاریاں — فصلِ گل میں زینتِ چاکِ گریباں ہو گئیں

چند باتیں وہ جو ہم رندوں میں تھیں ضرب المثل
اب سُنا مرزاؔ کہ وردِ اہلِ عرفاں ہو گئیں

(مرزا محمد ہادی بی اے)

دیکھی جھلک جو عشق کی کل بزمِ راز میں
تصویرِ مرگ پھر گئی چشمِ مجاز میں

شعلے لگے دہن سے نکلنے نفس کے ساتھ
قلب و جگر حریف بنے سوز و ساز میں

دشتِ ہوس میں آگیا طوفانِ اشکِ شرم
برقِ فنا سے آگ لگی کشتِ آز میں

پائے شکیب ڈگنے لگے فرطِ خوف سے
ہوش و حواس چل دیئے اس ترکتاز میں

علم و عمل کا دفترِ پارینہ لٹ گیا
زہد و ورع لپٹ گئے سب جانماز میں

بھاگی سپاہِ عقل گئے ہاتھ پاؤں پھول
چوٹیں چلیں جو بیخودی و امتیاز میں

یکبارگی حجاب جو تھے دور ہو گئے
باقی رہا نہ فرق نماز و نیاز میں

منصب ملا جو شوق کو پھر احتساب کا
بحثیں شروع ہو گئیں مے کے جواز میں

بولا کہ حکمِ پیرِ مغاں جو ہو وہ کرو
خودداریاں نہ چاہئیں اہلِ نیاز میں

مانا کہ مے حرام سہی یہ حلال ہے
پینا پڑے کا خونِ جگر بزمِ ناز میں

دربارِ عشق میں جبھی ضامنؔ ملے گا بار
جب وسوسہ رہے نہ دلِ پاکباز میں

سید محمد ضامن کنتوری

جب کہ ہونٹوں سے لعلِ شکریں چھوٹے ہوئے
لفظ جو دشنام کے نکلے وہ سب ٹوٹے ہوئے

بزمِ دشمن سے اب آئے ہو مرے ٹوٹے ہوئے
ہوش میں آؤ کہیں جڑتے ہیں دل ٹوٹے ہوئے

تم یہاں دیکھو تو آکر ہجر میں کیا حال ہے؟
دل کے ہاتھوں آج سو سو حشر ہیں ٹوٹے ہوئے

وائے ناکامی کہ گلشن میں خزاں آنے لگی
دو ہی دن گذرے تھے ہم کو قید سے چھوٹے ہوئے

چاہنے والے تری فرقت میں جی سکتے نہیں
زندگی سے ہیں وفاداروں کے جی چھوٹے ہوئے

دلفریبی لالہ رویوں کی نہیں مٹتی کبھی
یہ ستمگر خاک ہو کر بھی تو گل بوٹے ہوئے

سچ ہے یہ گرنا کسی کی آگ میں اچھا نہیں
دل کو روتے ہیں جگر کے آبلے پھوٹے ہوئے

شمع کا آنسو نہیں تھمتا ہے انکی یاد میں
اڑتے پھرتے ہیں جو پروانوں کے پر ٹوٹے ہوئے

اپنی سوزش کا کیا ہے شمع نے اچھا علاج
رکھ لئے ہیں دل میں پروانوں کے پر ٹوٹے ہوئے

سُونگھے شاعر اگر ہے کچھ دماغ بُوئے گُل
میرے گلشن کے یہ تازے پھُول ہیں ٹوٹے ہوئے

(آغا شاعر قزلباش دہلوی)

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

منصور کو ہوا لب گویا پیام موت
اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی

ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر
ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی

میں انتہائے عشق ہوں تو انتہائے حُسن
دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

عذر آفرین جرم محبّت ہے حُسن دوست
محشر میں اور عذر نہ پیدا کرے کوئی

چھپتی نہیں ہے یہ نگہ شوق ہم نشین
پھر اور کس طرح انہیں دیکھا کرے کوئی

اڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طور پر کلیم
طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی

سو سو امید بندھتی ہے اک اک نگاہ پر
مجھ کو نہ ایسے پیار سے دیکھا کرے کوئی

دیکر جھلک سی آپ تو پردے میں ہو رہے
اور رہ گئے نگاہ کو ڈھونڈا کرے کوئی

نظارہ کو یہ جنبش مژگان بھی بار ہے
نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

محفل ہو شغل مے ہو شب ماہتاب ہو
اور میں گروں تو مجھ کو سنبھالا کرے کوئی

بولے بھی سُن کے قصّۂ ہجراں تو یہ کہا
کی دل لگی تو یہ بھی گوارا کرے کوئی

کھل جائیں کیا مزے ہیں تمنائے شوق میں
دو چار دن جو میری تمنا کرے کوئی

اقبال عشق نے مرے سب بل دیئے نکال
مدت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

(شیخ محمد اقبال)

روشِ حسن مراعات چلی جاتی ہے — ہم سے اور اُن سے وہی بات چلی جاتی ہے
کچھ رہی تھی ہوسِ مے سو تغافل سے ترے — وہ بھی اے پیرِ خرابات چلی جاتی ہے
ہم سے ظاہر ہیں وہ ہر چند خفا ہیں لیکن — کوششِ پرششِ حالات چلی جاتی ہے
دن کو ہم اُن سے بگڑتے ہیں تو شب کو ہم سے — رسمِ پابندیِ اوقات چلی جاتی ہے
ہائے رے سادگیِ شوق کہ اب تک اُن سے — خواہشِ لطفِ ملاقات چلی جاتی ہے

اُس ستمگر کو ستمگر نہیں کہتے بنتا
سعیِ تاویلِ خیالات چلی جاتی ہے

(حسرت موہانی)

نویدِ یاس دیتی ہے مجھے ہر آرزو میری — نہ کر مٹی خراب اے سعیِ بے انجام تو میری
چھپے ہو سات پردوں میں بھی تم تو اس سے کیا حاصل — تماشے عشق میں رسوائیاں ہیں کو بکو میری
چھپو گے کیا میرا ذوقِ طلب بھی تم نے دیکھا ہے — ورائے لامکاں ہے انتہائے جستجو میری
بہ پیچ و تاب یہ الجھن یہ اندازِ پریشانی — کہانی تیرے گیسو کہہ رہے ہیں مو بمو میری
جہت کی قید کو توڑا ہے سودائے محبت نے — لگی ہیں تیرے پہرے پر نگاہیں سو بہ سو میری
ترا انصاف گر مجھ کو ذرا آنکھیں دکھاتا ہے — بندھا دیتا ہے ڈھارس مژدہ لاتقنطوا میری
طلب نے کھائی ہیں وہ ٹھوکریں راہِ تمنا میں — کہ آخر مجھ سے شرمانے لگی ہے آرزو میری
وہ گل ہوں سادگی ہیں میری سو رنگینیاں نکلیں — مشامِ روح کو بھاتی ہے بھینی بھینی بو میری
مرا ہر لفظِ سادہ اک صدف ہے درِّ معنی کا — سمجھ پیدا کرے تو کوئی سمجھے گفتگو میری
تصنع کا نہیں احسان میری قدر و قیمت پر — ملی فطرت سے مجھ کو مثلِ گوہر آبرو میری

[illegible] مانعِ مشکل پسندی ہو نہیں سکتی
ادب سے [illegible] نیرنگ طرزِ گفتگو میری

(نیرنگ)

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY HYDERABAD-7

ہنس کے فرمانے لگے سُن سُن کے وہ نالے مرے
آپ کب سے ہو گئے ہیں چاہنے والے مرے

ٹوٹ جاتی ہے جو چلتے ہیں کسی کانٹے کی نوک
پھوٹ کر روتے ہیں کیا کیا پاؤں کے چھالے مرے

اُلفتِ قامت میں موزوں ہی ہر اک مصرع مرا
عشق نے سانچے میں سارے شعر ہیں ڈھالے مرے

قبر میں کوئی خبر لینے نہ آیا بعد مرگ
زندگی تک تو بہت تھے چاہنے والے مرے

جام بھر کر غیر کو دینا مجھے خالی گلاس
تیری بیہوشی کے صدقے جاؤں متوالے مرے

ضبطِ اُلفت کی قسم کھاتا ہوں لیکن کیا کروں
جان کھا جاتے ہیں ارشد پوچھنے والے مرے

(مرزا ارشد گورگانی)

یہاں تک عشق نے دل کو نچوڑا اپنے پنجۂ غم سے
ٹپکتا ہے لہو ہر وقت اپنی چشمِ پُرنم سے

نہ کر صیاد اتنا ظلم طاقت ہے کہاں ہم سے
قفس کو لیکے کیا اُڑ جائینگے بے بال و پر ہم سے

نہ کرنا قصد ہمدم زخمِ دل کی چارہ سازی کا
محبت میں ہماری داغ لگ جائے گا مرہم سے

سحر ہے شمع اب بجھنی ہی تارے جھلملاتے ہیں
وہ جاتے ہیں یہاں آنسو رواں ہیں چشمِ پُرنم سے

خدا رکھے تمہاری چاند سی صورت کا کیا کہنا
بلائیں حُسن بھی لیتا ہے پیہم زلفِ پُرخم سے

نہ بہلا مجھ کو بس اے چارہ گر تو آپ ناداں ہے
جگر کا زخم بھی اچھا کہیں ہوتا ہے مرہم سے

یہ کیسی زندگی ہے روز جینا اور مرنا ہوں
کسی کے وصل کی اُمید سے اور ہجر کے غم سے

اسے دیکھے سے اپنی سینہ چاکی یاد آتی ہے
چھپا لے اے ردائے شب گریباں سحر ہم سے

ہوائے گرم سے چرخ آگ برساتا ہی یہ ضد ہے
مری تُربت کا سبزہ جب ہرا ہوتا ہے شبنم سے

شبِ مہتاب کا عالم نظر آتا ہے آنکھوں کو
لحد میں چاندنی چھٹکی ہی داغِ حسرت و غم سے

ہوئے دامن بہت افزائے بساطِ عیش دشمن وہ
گلے مل مل کے یاں روئی تمنا رات بھر ہم سے

اگر ہے دید کا طالب نگاہِ شوق پیدا کر
نہ تو باہر ہے عالم سے نہ وہ باہر ہے عالم سے

طلب گر نعمتِ اعلیٰ کی ہے کم پر قناعت کر
گلوں کو دیکھ پیاس آخر بجھا لیتے ہیں شبنم سے

خدا ہی دے جزا اسکی شہیدانِ محبت کو
دلوں پر داغ کیا کیا لیگئے اِس باغِ عالم سے

خدا بخشے۔ بیابانِ جنوں میں گو اکیلا تھا
بڑی رونق تھی اے سجاد پھوپھی قیس کے دم سے

(سجاد عظیم آبادی)

عید اور انتظارِ یار

کہتے ہیں عید ہے آج۔ اپنی بھی عید ہوتی
ہم کو اگر میسّر جاناں کی دید ہوتی

قیمت میں دیدِ رُخ کی ہم نقدِ جاں لگاتے
بازارِ ناز لگتا دل کی خرید ہوتی

کچھ اپنی بات کہتے کچھ میرا حال سنتے
نازِ و نیاز کی یوں گفت و شنید ہوتی

جلوے دکھاتے جاتے وہ طرزِ دلبری کے
اور دل میں یاں ہوائے نازِ مزید ہوتی

تیغِ نظر سے دل پہ وہ وار کرتے جاتے
اور لب پہ یاں صدائے ہل من مزید ہوتی

ابرو سے اُن کے غمزہ نیبر ادا لگاتا
یہ دل قتیل ہوتا وہ جاں شہید ہوتی

کچھ حوصلہ بڑھاتا اندازِ لطفِ جاناں
کچھ دغدغہ سا ہوتا۔ کچھ کچھ اُمید ہوتی

لیکن یہاں تو حرماں ہے ثمرۂ تمنّا
کیوں قفلِ آرزو کی پیدا کلید ہوتی

آنکھیں ترس رہی ہوں جب اُس کی اک جھلک کو
نیبرنگِ منتظر کی کیا خاک عید ہوتی؟

(نیبرنگ)

کبھی کچھ کبھی کچھ

کبھی غبار مرا آسماں پہ اُڑتا ہے
کبھی زمیں یہ کہتی ہے مجھ کو کر سجدہ

کبھی طریقِ تعلق سے آشنا ہوں میں
کبھی وہ رند کہ رندی بھی جس کی ہو بکنا

کبھی ہوں وہ کششِ رنگ و بو کہ ٹوٹ پڑیں
مرے کرشموں کو دیکھیں جو دیدۂ بینا

جمالِ یار کبھی ہوں مزاجِ یار کبھی
دو رنگیوں میں بسر کر رہا ہوں میں تنہا

کبھی خوشی مری تصویر سے جھلکتی ہے
اُداسیوں سے کبھی رنگِ رُخ ہوا پھیکا

کبھی کمالِ ترقی اُبھارتا ہے مجھے
کبھی جمالِ تنزل کا کھنچ گیا پردا

کسی کے ہونٹ جو ہنستے ہوئے نظر آئے
تو میری آنکھ سے خوں تابۂ جگر ٹپکا

کہیں جو حسرت و اندوہ کے سُنے چرچے
پکاری جوششِ ساغر بیا بنوش بیا

ستم کا لطف جفا کا مزہ نگہ کی خلش
جو میرے دل سے کوئی پوچھتا تو میں کہتا

ہوائیں آئیں گھٹائیں اُٹھیں بہت برسا
برائے نام مگر تھا بہار کا چھینٹا

ابھی تمازتِ خورشید کو ترستے تھے
ابھی اُسی نے چکا چوند سے کیا اندھا

ابھی تو خشک تھے دریا ابھی نہ اور نہ چھور
ابھی تھا پھول مرے ہاتھ میں ابھی کانٹا

ابھی کسی کی محبت میں جان دیتا تھا
ابھی کسی کا گلا کاٹنے کو تیز چھرا

ابھی میں غیر کی بربادیوں پہ ہنستا تھا
ابھی میں اپنے مٹانے پہ تل گیا دیکھا؟

غرض عجیب تلاطم ہے زندگانی میں
اِدھر اُدھر نہ بہے کیوں بہاؤ کا تنکا

ہے سچ تو یہ کہ بُری آکے بن گئی شاعر
خدا ہی پار لگائے غریب کا بیڑا

آغا شاعر قزلباش دہلوی

کچھ ہو مگر قصور نہ ہمت میں چاہیئے
انسان کو وضع پاس مصیبت میں چاہیئے

اِک داغ مہر سینہ پہ تربت میں چاہیئے
زیر کفن یہ شمع بھی ظلمت میں چاہیئے

اے دل نہ فرق معنی و صورت میں چاہیئے
مظہر صفائے آئینہ طینت میں چاہیئے

فکرِ کشود کار مصیبت میں چاہیئے
دامان صبر پنجۂ ہمت میں چاہیئے

بجز ملال ہیں ہو نہ راحت میں خود نما
یہ رنگ آدمی کی طبیعت میں چاہیئے

واعظ بشر کی حور سے کیا ہوگی دل لگی
تھوڑی مناسبت بھی طبیعت میں چاہیئے

ہے شرطِ عقل کوشش کسب کمال فن
دامن پہ داغ نقص نہ شہرت میں چاہیئے

بولے وہ اپنے کشتۂ حسرت کو دیکھ کے
یہ شکل بھی مرقع عبرت میں چاہیئے

فرقت میں برقِ خرمن صبر و سکوں ہیں اشک
طفلی سے یوں کمال شرارت میں چاہیئے

جس جا کٹی ہے عمر وہیں کیوں نہ ہو لحد
کچھ یادگار کوچۂ الفت میں چاہیئے

انساں رہے عروج میں بھی بنکے خاکسار
منعم یہ سُرمہ چشم بصیرت میں چاہیئے

اشکوں سے ہر مژہ پہ صف آرا ہیں لخت دل
ایسا امام ایسی جماعت میں چاہیئے

مل جائے نانِ خشک تو نعمت سمجھ اُسے
پیوند حرص کا نہ قناعت میں چاہیئے

بیمہریٔ زمانہ سے دل سرد ہے تو ہو
افسردگی نہ آتش غیرت میں چاہیئے

ریحانِ باغ حکمت و تہذیب ہو سخن
کوئی ثمر تو نخل ریاضت میں چاہیئے

گردوں نشین ہے خاک میری بنکے گرد باد
یوں کوششِ عروج فلاکت میں چاہیئے

دل تنگ کیوں ہیں سب مرے فریاد و آہ سے
کرتا ہوں وہ جو کچھ شب فرقت میں چاہیئے

اُس رُخ کی یاد آئینہ دار خیال ہے
ایسا ہی رہنما مجھے حیرت میں چاہیئے

ابروئے یار کا کلمہ پڑھ رہی ہے تیغ
عادل سوالِ جرح شہادت میں چاہیئے

آنکھوں میں لخت دل ہیں پرے ہے فوج اشک
یہ فرق بادشاہ و رعیت میں چاہیئے

شیدا ازل سے شاہدِ معنی کا ہے حبیب
ایسا انیس گوشہ عزلت میں چاہیئے

(حبیب کنتوری)

نشاط و نور سے لبریز اک عالم کی جھولی ہے
گرہ چین جبیں کی کس بت مہوش نے کھولی ہے

یہاں کہتے ہیں مر ناز ندۂ جاوید ہونے کو
زمانہ سے نرالی منزلِ جاناں کی بولی ہے

متاعِ صبر کا نام و نشاں باقی نہیں چھوڑا
یہ دزدیدہ نگاہوں نے گرہ دل کی ٹٹولی ہے

قیامت ہے تری کس کس ادا سے دل بچے ظالم
جو آنکھیں شوخ و پرفن ہیں تو صورت بھولی بھولی ہے

اشارہ صاف کرتی ہے ترے سینہ کی موزونی
کہ جنسِ حسن قدرت نے ذرا سی کانٹے میں تولی ہے

شرابِ ناب کے جلوے نگاہِ ناز پر صدقے
ابھی سوتے سے آنکھ اُس فتنۂ دوراں نے کھولی ہے

گُلِ نغمہ تکلم سے ترے دامن میں بلبل کے
تبسم نے بھری پھولوں سے فصلِ گُل کی جھولی ہے

مسلّم ساتھ ہے از بسکہ دامن اور چولی کا
کیا جب میں نے دامن چاک پھاڑی ساتھ چولی ہے

حصولِ مدعا اب کوئی دن کی بات ہے حسرت
نگاہیں مل چکی ہیں گفتگو مطلب کی ہوئی ہے

محمد حبیب الرحمن خاں شروانی

نگاہ پائی ازل سے جو نکتہ بیں ہیں نے
ہر ایک چیز میں دیکھا اُسے یقیں میں نے

سوالِ دید میں لذت ہے اے کلیم ایسی
ہزار بار سُنی ہے وہی نہیں میں نے

قطعہ

سُنے کوئی مری غربت کی داستاں مجھ سے
بھلایا قصہ پیمانِ اوّلیں میں نے

لگی نہ میری طبیعت ریاضِ جنت میں
پیا شعور کا جب جامِ آتشیں میں نے

رہی حقیقتِ عالم کی جستجو مجھ کو
دکھایا اوجِ خیالِ فلک نشیں میں نے

ملا مزاج تغیر پسند کچھ ایسا
کیا قرار نہ زیرِ فلک کہیں میں نے

نکالا کعبے سے پتھر کی مورتوں کو کبھی
کبھی بتوں کو بنایا حرم نشیں میں نے

کہا کسی نے فسانہ جو عرش و کرسی کا
وہ سادہ لوح ہوں بس کر لیا یقیں میں نے

کبھی میں ذوقِ تکلم میں طور پر پہنچا
چھپایا نورِ ازل زیرِ آستیں میں نے

کبھی صلیب پہ اپنوں نے مجھ کو لٹکایا
کیا فلک کو سفر چھوڑ کر زمیں میں نے

کبھی میں غارِ حرا میں چھپا رہا برسوں | دیا جہاں کو کبھی جامِ آخریں میں نے
کبھی میں قتل ہوا کربلا کے میدان میں | کہی کسی کو ستم پر بھی آفریں میں نے
سنایا ہند میں آ کر سرودِ ربانی | پسند کی کبھی یونان کی سرزمیں میں نے
دیارِ ہند نے جس دم مری صدا نہ سنی | بسایا خطۂ جاپان و ملکِ چیں میں نے
بنایا ذرّوں کی ترکیب سے کبھی عالم | خلافِ معنیٔ تعلیمِ اہلِ دیں میں نے
اٹھائے تلخیٔ انکار میں مزے کیا کیا | بنا کے ایک زمانے کو نکتہ چیں میں نے
لہو سے لال کیا سینکڑوں زمینوں کو | جہاں میں چھیڑ کے پیکارِ عقل و دیں میں نے
سمجھ میں آئی حقیقت نہ جب ستاروں کی | اسی خیال میں راتیں گذار دیں میں نے
ڈرا سکیں نہ کلیسا کی مجھ کو تلواریں | سکھایا مسئلۂ گردشِ زمیں میں نے
کشش کا راز ہویدا کیا زمانے پر | لگا کے آئینۂ عقلِ دُور بیں میں نے
کیا اسیر شعاعوں کو برقِ مضطر کو | بنا دی غیرتِ جنت یہ سرزمیں میں نے
مگر خبر نہ ملی آہ! رازِ ہستی کی | کیا خرد سے جہاں کو تہِ نگیں میں نے

ہوئی جو چشمِ مظاہر پرست وا آخر
تو پایا خانۂ دل میں اُسے مکیں میں نے

عجیب طرز ہے کچھ گفتگوئے واعظ کا | خدا بچائے یہ باتیں سنی نہیں میں نے
وہ چیز نام ہے جس کا جہاں میں آزادی | سُنی ضرور ہے دیکھی کہیں نہیں میں نے
نہ توڑ میرے دلِ دردمند کو ظالم | بڑی تلاش سے پایا ہے یہ نگیں میں نے
خدا تو ملتا ہے انساں ہی نہیں ملتا | یہ چیز وہ ہے کہ دیکھی کہیں کہیں میں نے

عجیب شے ہے صنم خانۂ امیرِ اقبال
میں بُت پرست ہوں رکھ دی کہیں جبیں میں نے

اقبال

اکڑ کے دوش پہ کیونکر نہ زلف ناز کرے | اُسی کے ہاتھ ہے وہ جس کو سرفراز کرے

بیک اشارہ نہ میں تھا نہ غیر محفل میں — اُن ابروؤں کی خدا زندگی دراز کرے
مرے حسابوں تو عاشق نہیں حریص ہے وہ — فراق و وصل میں کچھ بھی جو امتیاز کرے
نگاہِ ناز سے مطلب مرا کچھ اور نہیں — کسی طرح سے خدا اُس کو دلنواز کرے
کچھ اور بزم میں اپنی دعا نہیں ساقی — تری نگاہ کو اللہ پاک باز کرے
کہیں تو جام دھرا ہے کسی طرف ساغر — کدھر جھُکائے سر انسان کدھر نماز کرے
بہت دنوں سے ہے خالی فقیر کا کشکول — بس اب نگاہِ کرم وہ گدا نواز کرے
شراب جام میں دی تو نے ساقیا یا زہر — کسے دماغ ہے کون اس کا امتیاز کرے
گلہ ہے آنکھوں پہ ہے اُسکا لیکن اے قاصد — ہم ایسے ہیں تو ہمیں کیوں امین راز کرے
فقط بھروسے پہ تیرے ہے زندگی اپنی — خدا حیات تری اے اجل دراز کرے
ہم اپنے آپ نہیں جب تو ہونگے غیر کے کب — زمانہ شاد ہم ایسوں سے احتراز کرے

شاد عظیم آبادی

نقاہت یُوں سمائی رُوح بنکر جامہ تن میں — رگِ گردن میں ہیں وہ تار جو الجھے تھے دامن میں
کبھی کیفیت دستِ جنوں دیکھی نہ گلشن میں — نجانے کن گلوں کی خاک ہے صحرا کے دامن میں
نہ رُوٹھیں کیوں غمِ بیجا ملی وجہِ تکدّر ہے — ہوا تخمِ امل یہ باد خاک اُڑتی ہے ساون میں
نظر دیوارِ قصرِ یار سے پلٹے تو کیا پلٹے — لگے ہیں پردہ ہائے چشم دیوار دُکھی روزن میں
چمکتا قلب مُکدر ہیں ہے یادِ مہرِ عارض سے — ہمارا شورہ زار دل ہے صحرا ہیں نہ گلشن میں
بندھا رُخ کا تصوّر لخت دل اشکوں کا ٹیکا تھا آئے — جینے بے زحمت سیرِ گلستاں پھول دامن میں
ملی ہے منزلِ مقصد کسے بے رہبرِ کامل — گیا بے منتِ تارِ نظر کب رشتہ سوزن میں
ہی تکبیرِ قاتل سے حلاوت موت کی تلخی — لبِ معجز نما نے قند گھولا آب آہن میں
ہزاروں خارِ دشت آرزو تلووں میں ٹوٹے ہیں — بنا ہے کارِ سوزن مدتوں تک جامۂ تن میں
لگائے تو نے کیوں تارِ شعاعِ مہر اے گردوں — نظر کے تار کیا کم تھے درِ جاناں کی چلمن میں
ترے قامت کو آثارِ قیامت خلق کتنی تھی — سکھا دی تھیں ادائیں شوخیوں نے اپنی بچپن میں

یقیں کیا ہو حبیب تم نے پیری میں توبہ کی
ہیں دھبے سینکڑوں اب تک مئے گلگوں کے دامن میں

حبیب کنتوری

مژدہ وصالِ یار کا آیا نہیں ہنوز
دیدارِ دوست آنکھ نے پایا نہیں ہنوز

ہو جس میں بوئے مہر و وفا گل نسیم نے
ایسا کوئی چمن میں کھلایا نہیں ہنوز

موسیٰ تو کوہِ طور پہ غش کھا کے گر پڑے
پردہ کو تو نے رُخ سے اٹھایا نہیں ہنوز

بسمل تڑپ رہا ہے مگر تو نے عشق از زخم
کاری جگر پہ کوئی لگایا نہیں ہنوز

بے تاب ہو گئے ترے جھونکوں سے اے نسیم
پیغامِ یار تو نے سنایا نہیں ہنوز

اچھے رہے کہ مفت میں بدنام ہو گئے
اور اشک چشمِ تر سے گرایا نہیں ہنوز

افسوس تو نے مرغِ نواخوانِ صبحدم
سوزِ درونِ عشق کو پایا نہیں ہنوز

اے آفتابِ حشر تو کیوں کانپنے لگا
میں نے تو داغِ دل کو دکھایا نہیں ہنوز

ابرِ بہار بھی ہے جنوں بھی ہے کیا سبب
دامن پہ ہاتھ اُس نے بڑھایا نہیں ہنوز

کیوں ساتھ چھوڑتا ہے سکندر کا خضر تو
آبِ حیات لب سے لگایا نہیں ہنوز

جل جل کے بجھ گئی شمعِ پیرے فرش
ہم نے چراغِ دل کو جلایا نہیں ہنوز

دل سُننے والوں کا میرے نالوں سے ہل گیا
جو دل میں بھید تھا وہ جتایا نہیں ہنوز

برہم ہوئی ہے محفلِ اربابِ معرفت
صادق نے دردِ دل کو سنایا نہیں ہنوز

صادق علی خاں

غم سے کہیں نجات ملے چین پائیں ہم
دل خون میں نہائے تو گنگا نہائیں ہم

جنت میں جائیں ہم کہ جہنم میں جائیں ہم
مل جائے تو کہیں نہ کہیں تجھ کو پائیں ہم

جورِ فلک میں خاک بھی لذت نہیں رہی
جی چاہتا ہے تیری جفائیں اُٹھائیں ہم

ڈر ہے نہ بھول جائے وہ سفاک روزِ حشر — دنیا میں لکھتے جاتے ہیں اپنی خطائیں ہم
ممکن ہے یہ کہ وعدے پر اپنی بھی وہ آئے — مشکل ہے یہ کہ آپ میں اُسوقت آئیں ہم
ناراض ہو خدا تو کریں بندگی سے خوش — معشوق روٹھ جائے تو کیونکر منائیں ہم
سر دوستوں کے کاٹ کر رکھے ہیں سامنے — غیروں سے پوچھتے ہیں قسم کس کی کھائیں ہم
کتنا ترا مزاج خوشامد پسند ہے — کب تک کریں خدا کے لئے التجائیں ہم
یہ اور کوئے یار کا چکر زہے نصیب — لیتے ہیں اپنے پاؤں کی اکثر بلائیں ہم
لالچ عبث ہے دل کا تمہیں وقتِ واپسیں — یہ مال وہ نہیں کہ جسے چھوڑ جائیں ہم
تاثیر کو سلام کریں دونوں ہاتھ سے — جس وقت اپنے ہاتھ دعا کو اٹھائیں ہم
سونپا تمہیں خدا کو۔ چلے ہم تو نامراد — کچھ پڑھ کے بخشنا جو کبھی یاد آئیں ہم
یہ جان تم نہ لوگے اگر آپ جائے گی — اس بے وفا کی خیر کہاں تک منائیں ہم
ہمسائے جاگتے رہے نالوں سے رات بھر — سوئے ہوئے نصیب کو کیونکر جگائیں ہم
مانو کہا جفا نہ کرو اب وفا کے بعد — ایسا نہ ہو کہ پھیر لیں اُلٹی دعائیں ہم
دشمن سے ملتے جلتے ہو خاطر سے دوست کی — کیا فائدہ جو دوست کو دشمن بنائیں ہم

[illegible] نہیں خوب یاد رکھ
[illegible] تجھے دل ہی بھلائیں ہم

خدا کے راہ کے سالک سے کیا بہانہ چلے — چلیں گے ہم نہ بُری چال گر زمانہ چلے
ہمارے ساتھ کوئی چال کیا زمانہ چلے — چلیں گے ہم نہ وہ رستہ جو رہنما نہ چلے
وہ دیکھو سامنے جاتا ہے راہبر اپنا — ہم اس طرف ہیں چلے کوئی اور اُدھر نہ چلے
ہم اُس کے ساتھ چلیں جو کہ راہ بھولا ہو — ہمارے ساتھ وہ ہی دو قدم چلا نہ چلے
یہ وجہ ہے کہ نگاہیں بچا کے چلتے ہیں — ہم ہی چلیں ترے رستہ پہ دو ہمرا نہ چلے
عوام راہِ ضلالت پہ [illegible] — عجب کیا ہے جو رستہ کا کچھ پتہ نہ چلے
یہ خوف ہے کہیں ذلت سے رخ نہ پھر جائے ؛ خدانخواستہ یہ چال اگر زمانہ چلے

کرے قفس سے نہ پرواز مرغ قبلہ نما — زمانہ میں کہیں ایسی کوئی ہوا نہ چلے
خدا نخواستہ بے رُخ ہو وہ قدر انداز — کہ جس کے تیر کے بلنے کو خود نشانہ چلے

مرزا محمد ہادی لکھنوی

راز اُس کے عشق کا عالم میں افشا ہو گیا — میں تو رسوا ہو چکا تھا وہ بھی رسوا ہو گیا
قامتِ موزوں کی مدحت میں کہی میں نے جو کی — لیکے برچھی سرو بستاں مجھ پہ سیدھا ہو گیا
وہ چلے جس دم قیامت نے لٹی بڑھ کر قدم — فتنے اُٹھ اُٹھ کر پکارے حشر برپا ہو گیا
مر گیا عاشق تمہارا پائی مُنہ مانگی مُراد — دل میں خوش ہو لو تمہارا اب تو چاہا ہو گیا
مانع دیدار تھا اُس روئے روشن پر نقاب — جب وہ بے پردہ ہوئے آنکھوں کا پردہ ہو گیا
کیا نوید جانفزا تھی تیرے آنے کی خبر — یک بیک حال مریض عشق اچھا ہو گیا
ہو گئی غم کھانے کی عادت ہوتے ہوتے ای فلک — کوئی غم کھاتا بھی کیا مُنہ کا نوالا ہو گیا
کان بہرے کر دہ میری فریاد کو سننے لگے — بخت اتنا تو رسا اپنا نصیبا ہو گیا
فیض حاصل ہے جناب رُوح سے اُستاد کا — بخت میری نظم کا رتبہ دو بالا ہو گیا

سید امیر حیدر رنجت

پی پلا کر اُسے رحمت کی قسم دیتے ہیں — کیسے بتاتے ہیں کہ اللہ کی قسم دیتے ہیں
اِسی رفتار سے اُٹھے گی قیامت اک دن — پتہ تیرا ہم کو ترے نقشِ قدم دیتے ہیں
ان کی بھر دل میں نہ آجائیگا بندہ نوازا — لطف ملتا آپ کو اغیار کو جو ہم دیتے ہیں
کہہ رہی ہے میرے ساقی کی عنایت مجھ سے — لے چھلکتا ہوا ساغر تجھے ہم دیتے ہیں
داغ دیتے ہو جو دل پر تو ذرا ٹھنڈک سے — مُہر کے واسطے کاغذ کو بھی نم دیتے ہیں
دل جو قیمت نہیں بوسے کی تو پھر وہ بھی نہیں — ہاں تھا چھانٹی نہیں کرتے ہیں رقم دیتے ہیں

کوئی مضمون پھڑکتا ہوا لکھنا شاعر
آج ہم پھر نہیں قرطاس و قلم دیتے ہیں

آغا شاعر قزلباش

انتخاب مخزن

حصّہ دوم

رسالہ "مخزن" کی دوسری نو جلدوں کا انتخاب نظم و نثر
یوں ہی مخزن کا ہر مضمون قابل مطالعہ ہوتا تھا مگر یہ تو انتخاب ہے
ملاحظہ فرمائیے............ قیمت عہ

انتخاب مخزن

حصّہ سوم

اسے مخزن کے کل پرچوں کی روح کہئے۔ کیونکہ خان بہادر
شیخ عبدالقادر صاحب کے کل مضامین جو وقتاً فوقتاً رسالہ میں شائع
ہوتے رہے یکجا چھاپ دیئے گئے ہیں .... قیمت (عا)

ملنے کا پتہ

شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور

اُردوے معلّٰی یعنی مجموعہ رقعات مرزا غالب مرحوم قیمت

یادگار غالب یعنی سوانح عمری حضرت غالب اور ان کے
کلام پر ریویو۔ از جناب شمس العلما مولانا حالی مرحوم۔

شعر العجم حصّہ اوّل	از مولانا شبلی مرحوم	قیمت ــــ
" حصّہ دوم	"	"
" حصّہ سوم	"	"
" حصّہ چہارم	"	
" حصّہ پنجم	"	"
موازنہ انیس و دبیر	"	"
الفاروق	"	"
المامون	"	"

المشتہر

شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ

لاہور